ایک ورق
شمیم سیفی

ایک ورق

شمیم سیفی

(اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکادمی کا جزوی مالی تعاون حاصل ہے)

طابع دی آرٹ پریس سلطان گنج، پٹنہ ۶
ناشر نگہت الفاطمہ پبلی کیشن، بنگالی ٹولہ، لہیریاسرائے دربھنگہ
کاتب عبدالباقی
اڈیشن اول ۔ مارچ ۱۹۸۰ء
تعداد ایک ہزار
قیمت ۲۰ روپے

ملنے کے پتے

بک امپوریم ۔ احاطہ رحمانیہ ۔ سبزی باغ پٹنہ ۴ ۔
مکتبہ اسلامی، بی ۔ کے روڈ، لہیریاسرائے دربھنگا ۔
شبّیر احمد، لیڈی امام ہاؤس پتھر کی مسجد، پٹنہ ۔ ۶

انتساب

ان شفقتوں اور محبتوں کے نام
کہ
جن کا نام
محمد رزیق تھا

فہرست

نمودِ غبار — جلوۂ سراب

زندگی جلوۂ سراب۔ عالم حلقۂ دام خیال۔ ابتدا و انتہا لا معلوم۔

پھر حقیقت کیا ہے۔؟

۱۹۳۴ عیسوی؟ — عدم و وجود کے سلسلہ کا آغاز!

لیکن اس کے بعد —؟

پھر وہی افسانہ۔ کہ تسلسل ابھی ٹوٹا نہیں کہ وقت کے دریا کا بہاؤ بھی تھما نہیں کہ سب فتنہ ابھی باقی ہے۔

حقیقت اور افسانہ، اصل میں دونوں ایک ہیں۔ مانو تو افسانہ حقیقت۔ سوچو تو حقیقت افسانہ۔ میں ہوں ایک حقیقت۔ میں تھا، ایک MYTH۔ میں رہونگا ایک شائبہ۔ میں نہیں ہونگا، ایک بڑی حقیقت۔

سیتا کے متھلا پوری میں جس کے شمال میں عظیم پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ اور جہاں باگمتی دبے پاؤں بہتی ہے۔ جہاں کے چوڑے سبز پتوں سے ڈھکے تالاب — اور جہاں ودیاپتی کی شاعری کا جادو سارے بن پھیلا ہوا ہے۔ وہاں ایک بستی ہے ملکی چک، جو ابھی افسانہ نہیں ہوئی۔

ہاں! وہاں تھے ایک سیف الدین حسین جو افسانہ ہو گئے۔ پھر ان کے لڑکے محمد رزیق (وکیل)........ ہائے! خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اور میں اپنے ان بزرگوں کو لالہ و گل میں نمایاں دیکھ کر اپنی شناخت کی کوشش کرتا ہوں۔

لیکن دریا کے تیز دھارے میں بہتے ہوئے تنکے کی شناخت کیا۔؟ — پہچان کیا؟؟

انگریزی ادب میں ایم۔اے کی ڈگری۔ لا (قانون) کی ڈگری وکالت کا پیشہ۔ پھر عدلیہ کا اعلیٰ عہدہ — کیا یہ خس و خاشاک اور مشتِ غبار کے لئے شناختی کارڈ بن سکتے ہیں!!

نقشِ سرِ ورق

آج اپنے شعور کی کشتی میں سوار میں گئے دنوں کی طرف رواں ہوں ۔ راہ
میں چلتے ہوئے کسی کو اچانک موتی مل جاتا ہے تقریباً اٹھائیس سال قبل ایسے ہی
اچانک مجھے شمیم مل گیا ۔ میں نے تب سے ابتک اس کی شخصیت کا ورق ورق
پڑھا ہے اور یہ جان پایا ہوں کہ اس کے فن کا سرچشمہ زندگی ہے ، وہی زندگی
جسے وہ مر مر کر جنیا رہا ہے ۔ ادب سے اس کا تعلق جز وقتی نہیں بلکہ بھرپور ہے ۔
گو کہ مصروفیتوں سے کچھ ایسے لمحات نکال لینا جو تخلیق کی بھٹی میں تپ کر ایسے
فن پارے بن سکیں کچھ شمیم کا ہی حصہ ہے ۔ اس نے اگر محبت کی ہے تو صرف
ادب سے ۔ ادب کو جانا ہے اور [illegible] تاریخ کا حوالہ ، داخلی شکست وریخت کا
آئینہ اور گرد و پیش کی صدائے بازگشت سمجھا اور ان پر اصرار ہم دونوں کیلئے
ہمیشہ قدر مشترک رہا ہے ۔ شمیم کا قلم انسان کی بازیافت کا جویا ہے اور
انسان کے لئے زیست کرنے کا حق طلب کرتا ہے ۔ عصر حاضر کی منفی قوتوں
سے برسرپیکار رہنے کے باوجود اس کی تلخی میں ملامت نہیں بلکہ ملاحت ہے ۔
اس کے تجربوں نے اظہار کی دلآویزی میں زبان پائی ہے ۔ میں واقف ہوں
کہ آزمائشوں میں بھی اس نے جی نہیں ہارا اور صبر آزما مراحل میں ظرف دنگیر

سیر بنا کر زندگی کرنا رہا اور ریاضت و خلوص سے اس نے اپنے فن کو ایسی جلا بخشی کہ اس کی ہر تحریر ایک نیا وجود ہے۔

ویسے دیکھئے تو شمیم بڑا سادہ، خاموش اور سنجیدہ دکھائی دیتا ہے۔ جیسے جاڑوں کی شام ہو لیکن فاصلوں کے سمٹنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ کیسا گھر یا یار ہے۔ کچھ "بزرگ دوست" ہوتے ہیں، کچھ "عاقل دوست" ہوتے ہیں، کچھ قائد، فلاسفر، دانشور اور کچھ "نادان" دوست ہوتے ہیں۔ شمیم صرف دوست ہے۔ خوشی اور غم میں برابر کا شریک، بغیر کسی کا مپلیکس کے، ایکدم TRANSPA-RENT۔ دلبری اور دوست نوازی کے جن رموز سے وہ واقف ہے ان کے نسخے شاید وضعداری اور ایثار کے سینوں میں دفن ہیں اور ان کا پانا سبھوں کے لئے ممکن نہیں۔

میرا اور شمیم کا عجیب رشتہ ہے۔ یوں کہ جیسے وہ میرا دیباچہ ہوا اور میں اس کی تمہید۔ جب ہم ایک دوسرے سے متعارف ہوئے تو ہم فی الفور جوان ہوئے تھے لیکن ہم دونوں کا یہی دور سب سے زیادہ کرب انگیز رہا ہے کہ یہیں سے فنکاری اور دانشوری کا خبط ہم پہ سوار ہوا۔ ذات کے حوالے سے کائنات اور کائنات کے حوالے سے ذات کو دیکھنے لگے اور حیات کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کی بجائے حیوان ہونے کا رویہ اپنا لیا۔ ہم انگاروں پر اس طرح چلے کہ اچانک ہم دونوں نے اپنے کو ضعیف العمر پایا۔ درمیان سے جوانی کہاں گم ہو گئی؟ پتہ نہیں۔ ہاں گئے دن ہمیں جمال پرستی کی ایک اور قدر مشترک کا تحفہ ضرور دے گئے جسے ہم نے اس طرح سنبھال کر رکھا ہے کہ ہم آج بھی نظاروں کو تماشہ کی طرح نہیں بلکہ نظر کی طرح دیکھتے ہیں اور نگاہ کے اس اصرار سے دکھوں کی لو تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی ہے۔ دریافت اور تلاش کے

عمل نے دراصل ہمیں بہت دکھ دیے ہیں۔

شمیم کی شخصیت بڑی INTEGRATED ہے اور اس کا رویہ ہمیشہ مثبت رہا ہے۔ اس نے کبھی یہ اصول نہیں اپنایا کہ "بوجھو تو جانیں"۔ اسکی شخصیت کا یہ رویہ اسکے فن میں پوری طور سے نمایاں ہے کہ وہ اپنے پانی کو گہرا دکھانے کیلئے سعی کرتا ہے اسے گدلا نہیں کرتا اور بڑی متانت اور انکساری سے وہ اس پر زور دیتا ہے کہ ادب روایات سے بغاوت یا پابندی کا ایک حسین سلسلہ ہے جو بہتے پانی کی دھار کے مانند ہمیشہ رواں ہے کیونکہ وہ آج بھی اس پر ایمان رکھتا ہے کہ ادب ایک نامیاتی حقیقت ہے۔ الفاظ کا اس نے کبھی "شخصی" یا "پرائیویٹ" استعمال نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ انہیں وسیلۂ معنیٰ بنایا ہے اس لئے کہ اس کی تحریر نظریات کے زیر سایہ نہیں پلتی ہے وہ جو کچھ لکھتا رہا ہے اور تخلیق کے لمحہ میں جس نے اسکے زخموں کو کریدا اور اگلی۔ CAMERA EYE کی گرفت میں آیا۔ اس نے اپنی تحریر کا تعلق ہمیشہ سماج سے براہ راست رکھا ہے کیونکہ چمن میں کھلنے والے اپنے دریچہ کو کبھی بھی اس نے بند نہیں کیا چاہے چاندنی کتنی ہی جان لیوا کیوں نہ رہی ہو۔

انتظار حسین کہتے ہیں "کہانی تو رات کا انعام ہے۔ کہانی وہ جس سے رات کی نیند اڑے اور دن کو مسافر رستہ بھولے۔ رات گئی، رات کے لوگ گئے۔ ان کے ساتھ رات کا انعام گیا۔" شمیم کے افسانے یقیناً رات کا انعام ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے درمیان رات کے لوگ اب بھی باقی ہیں جن میں بہت سے ان کہانیوں کو پڑھیں گے اور سنیں گے، رستہ وہ بھولیں گے یا نہیں اسکا پتہ آنے والا وقت دے گا۔

شفیع جاوید

۴ جنوری ۸۰ء

ایک ورق

شہسوار خاور نے چلتے چلتے افق کے گالوں پر زور کی چٹکی لی۔ افق کا چہرہ سرخ ہو کے تمتما اٹھا۔ اور اس نے لجا کر اپنے سیاہ دوپٹہ کو اور آگے کھینچ لیا۔ پھر دھیرے دھیرے ساری کائنات پر سیاہ سائے رینگتے گئے ــــ "ناتھ روڈ" پر زندگی کی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ دن بھر کی یہ خاموش سڑک شام ہوتے ہی جگمگا اٹھی ــــ مرجھائے حسن ارزاں جوانی اور سسکتے نغمے بکھرنے لگے ــــ ناتھ روڈ کوئی تفریح گاہ نہیں تھی۔ یہ ایک ویسی نرالی منڈی تھی جہاں حسن۔ جوانی اور جسم کا سودا ہوتا تھا۔

بازار کا نیا دن ہر شام سے شروع ہوتا۔ جب ساری دکانوں کو نئے سرے سے سجا دیا جاتا۔ باسی اور اترے مال بھی نمائشی لیپ چڑھا کر اسٹال پر رکھ دیئے جاتے ٹھیک ویسے حلوائی باسی مٹھائیوں کو ہلکی آنچ پر گرم کر کے تھالی میں سج دے تاکہ لوگ اس سے نکلتی ہوئی بھاپ کو دیکھکر تازہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں۔ جیسے اترے پھلوں کو رنگین کاغذ میں لپیٹ دیا جائے اور خریدار کی نگاہیں کاغذی دیدہ زیبی میں اٹک کر رہ جائیں۔ جیسے باکر جوتوں کو پالش سے چمکا کر ریک میں رکھ دیا جائے ....

.... سیاہی دبیز ہوتی گئی۔ مگر کمرے کے سینہ کا بوجھ ہلکا ہوتا گیا۔ اور کوٹھے آباد ہوتے رہے۔

"نیلم" نے پکارا "بوا" اور بڑھیا نے منہ میں پان کی گلوری ٹھونستے ہوئے "ہوں" کر دیا۔ "نیلم" خاموش رہی۔ بوڑھی بوا اٹھکر بالکونی میں آ گئی۔ ادھر ادھر نظر

دوڑاتی رہی اور پھر پان تھوک کر "نیلم" کے پاس کمرے میں آبیٹھی۔ اسنے کہا۔ "بیٹی! سڑک بھی سنسان ہوتی نظر آتی ہے۔ لیکن ابھی تک کسی نے ادھر دیکھا بھی نہیں۔" "نیلم" نے شغلاً پاس پڑے ہوئے ستار پر انگلی ماردی۔ ایک بے ربط سی جھنکار کمرے میں گونج گئی۔ بڑھیا پھر اکتا کر بڑبڑانے لگی۔ "کمبخت "پشپا" جب سے آئی ہے سارا بازار تو مندا پڑا ہی ہے۔ مگر آج جیسا پھیکا رنگ، تو کبھی دیکھا نہیں"۔ اور نیچے کچھ آہٹ پاکر وہ بالکونی میں دوڑی۔ لیکن فوراً ہی ناکام جھلاتی ہوئی واپس آگئی۔ شام کی چائے نہ ملنے سے وہ اور بھی چڑچڑی ہورہی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ کوئی مہمان آجائے تو اسکی خاطر تواضع میں اسکی اپنی چائے کا بھی بندوبست ہوجائے گا۔ مگر بدقسمتی سے آج کسی نے اسکے کوٹھے کی طرف نظر بھی نہ اٹھائی تھی ——— "نیلم" نے ایک طویل انگڑائی لی اور اٹھ کر سونے کے کمرے میں آکر پلنگ پر دراز ہوگئی۔۔

"نیلم" پڑے پڑے سوچنے لگی۔ آج کیسا منحوس دن تھا اس کے لئے دن کا کھانا بھی اسے یونہی سا ملا تھا۔ اور شام کی چائے کا تو خیر پوچھنا ہی نہیں۔ کیونکہ اسکی "بوا" نے صبح ہی ہر چیز ختم ہوجانے کا اعلان کردیا تھا۔ اور اسی لئے آج شام اسنے اپنے کو سویرے ہی ہال میں لا بٹھایا تھا۔ تاکہ رات اور کل دن کے کھانے کا انتظام ہوسکے ——— لیکن اس وقت تک اسکے یہاں کوئی نہیں آیا تھا۔ اسکے پرانے گاہک بھی آج "پشپا" کا دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے۔ اسے "پشپا" کی قسمت پر رشک آنے لگا۔ وہ سوچنے لگی "پشپا" کے آنے سے قبل بازار میں صرف اسی کے حسن و جوانی کا چرچا تھا ——— اور وہ اٹھ کر سنگھار میز کے پاس پہونچی۔ آئینہ میں اسنے اپنے چہرہ کا جائزہ لیا۔ آج اسکا چہرہ ہلکا معلوم ہورہا تھا۔ اسنو اور پاؤڈر سے بے نیاز۔ اسے محسوس ہوا۔ شاید اسی کمی نے اسے آج محروم رکھا ہو۔ اور دوسرے لمحے اسنے اسنو کی شیشی اٹھالی۔ لیکن

وہ خالی پڑی تھی۔ اُسے خیال آگیا آج شام اسنے اسی وجہ سے میک اپ نہیں کیا تھا۔ اُ
اسنے اسی دم اِسنو کی خالی شیشی اور پاؤڈر کے کھنکھناتے ڈبہ کو زمین پر دے مارا۔
شیشی چھن کرتی ہوئی چور ہو گئی اور ڈبہ ایک بھونڈی آواز دیتا ہوا دور لڑھک گیا۔
بڑھیا نے ہال سے چونک کر پوچھا "کیا ہے؟ "نیلم" ــــــ؟" اور وہ "کچھ نہیں" کہتی
ہوئی پھر پلنگ پر آکر اوندھی گر پڑی۔ اسکے پیٹ میں ہلکی سی بھوک کی خلش اٹھتی
محسوس ہوئی۔ اور اس نے اس چنگاری کو دبا دینے کیلئے ماضی کے دھندلکوں میں کھوجانے
کی کوشش کی ــــــ ماں کی یاد نے اسکی آنکھوں کو نم کر دیا۔ اسکی ماں ــــــ یہاں
کی مشہور رقاصہ۔ جسکے پورٹیکو میں "بیوک" اور "پونٹیک" جیسی شاندار موٹر کاریں بھی
کھڑی رہنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتی تھیں ـــ اور وہ خود تو بچپن ہی سے اس "بوا" کے
زیر تربیت چھوڑ دی گئی تھی۔ "بوا" کی زیر نگرانی وہ بڑھتی گئی اور پڑھتی گئی۔ پھر ایک
استاد اسے ناچ کی اعلیٰ تعلیم دینے کیلئے مقرر ہوئے۔ اسکی ماں کی خواہش تھی کہ اسکی
بیٹی بھی اس فن کی ماہر ہو کر اسکی قایم مقام بن سکے ــــــ لیکن اس سے یہ کام نہ
ہو سکا۔ اس کے پیر کبھی اس موافقت میں جنبش نہ کر سکے۔ آخر عاجز آکر اسے چھوڑ دیا گیا
ــــ ابھی وہ شباب سے ہمکنار ہی ہوئی تھی کہ اسکی ناکوں بھی بڑا سا نتھ ڈالدیا گیا۔
نہ معلوم کیوں؟ کچھ دنوں تک اسے وہ نتھ بڑا گراں گذرتا رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ
اسکی عادی ہوتی گئی ــــ پھر ایک رات .... اور نیلم کچھ سوچتے
سوچتے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ہال سے "بوا" کی آواز آئی "بیٹی سو گئی؟" اور ایسا معلوم ہوا
جیسے خیالات کے سمندر میں کسی نے کنکر پھینک کر سطح آب کو منتشر کر دیا ہو۔ تھوڑی دیر
بعد تخیل کی کڑیاں پھر جڑنے لگیں اور اسے وہ رات یاد آگئی۔ جو اسکی گھناؤنی زندگی
کی افتتاحی شب تھی ــــ ماں کی طبیعت ہفتوں سے ناساز تھی۔ پلیہ ماں۔ کھرد العہ پر

فیاضی سے لٹایا جا رہا تھا۔ لیکن انکی حالت میں کوئی نمایاں تبدیلی نظر نہ آ رہی تھی۔ ایک دن ماں اور بوا میں بہت دیر تک کھسر پھسر ہوتی رہی۔ اور اسی شام وہ ہال جو ماں کی علالت کیوجہ سے بند تھا۔ کھولا گیا۔ اور بوا نے اسے اپنی پوری محنت صرف کر کے سجا دیا۔ پھر "نیلم" کی ماں کے پاس طلبی ہوئی۔ ماں نے بتایا آج اسکے "نتھ" اترنے کا رسم ہے۔ پھر اپنے نحیف ہاتھوں سے وہ جوڑا پہنایا جو خاص انہوں نے اپنی رسم کے وقت پہنا تھا۔ جب "بوا" اسکا میک اپ کر کے دوبارہ ماں کے پاس لے گئی تو اسے دیکھ کر انکی آنکھوں سے دو قطرے آنسو ڈھلک گئے۔ اسے یاد ہے اسکا اپنا کلیجہ بھی پھٹا جا رہا تھا۔ لیکن فوراً ہی "بوا" اسے ہال میں لے آئی۔ وہاں پہلے ہی سے کوئی رئیس بیٹھے تھے انہوں نے "نتھ اتارا .... اس زحمت کی قیمت انہیں ہی ایک بھاری رقم ادا کرنی پڑی۔

اسکے بعد کا یہ معمول ہو گیا کہ ہر صبح "بوا" وہی "نتھ" اسکی ناک میں لٹکا دیتی اور ہر شام کوئی نہ کوئی اسکی ناک ہلکی کر دیتا۔ لیکن ماں کی موت کے بعد "نتھ" کا آواگون ختم کر دیا گیا اور وہ "پیشیا" کے آنے کے قبل تک شہر کی مشہور طوائف رہی۔ اسے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ عمدہ کھانا۔ اچھے کپڑے۔ اعلیٰ رہائش۔ لیکن اب "پشپا" نے آکر اسکی جگہ لے لی تھی۔ لیکن پھر بھی اسے اور "بوا" کو روزانہ کھانا مل ہی جاتا تھا۔ لیکن آج — ! وہ چونک پڑی۔ اسے بھوک کی خلش دوگنی محسوس ہونے لگی۔ وہ صبح ہی کی آدھی روٹی کھائے ہوئے تھی۔ اور اس رات کا یوں گذر جانا کل کے فاقہ کا پیش خیمہ تھا۔ اس خیال ہی سے "نیلم" تلملا اٹھی۔ وہ ہانپتی ہوئی ہال میں پہونچی۔ بڑھیا بیماری اور انتظار کرتے کرتے تھک سے نڈھال فرش پر پڑی سو رہی تھی۔ "نیلم" نے جھک کر پاندان سے پان کھانا چاہا۔ لیکن وہاں پان تو کجا کسیلی کی ایک ٹکڑی بھی نہ تھی۔ اسکی بوڑھی بوا نے سب کو صاف کر ڈالا تھا۔ وہ سوچنے لگی "بوا" اٹھکر پان نہ ملنے سے اور بھی پریشان ہو گی۔ لیکن وہ اسکا

انتظام کیوں کر کر سکتی تھی۔ بس سے باہر بات تھی ـــــ پھر وہ بالکونی میں آگئی۔
سڑک سنسان پڑی تھی۔ سامنے والے کوٹھے سے کچھ "ہی ہی" کی آواز آرہی تھی۔
یکایک اس کے دل میں دو جذبے اٹھکر ٹکرا گئے۔ حسد اور نفرت۔ لیکن نہ معلوم
کیوں بالکل انہونی طور پر نفرت کے جذبے نے حسد و رشک کے ہم آہنگ احساس
پر قابو پا لیا۔ وہ فوراً اپنے کمرے میں پلٹ آئی۔ اور پھر سوچتے سوچتے اسے اپنے
آپ سے بھی نفرت ہونے لگی۔ اس نے چاہا وہ اپنی اس گناہ آلود زندگی کا خاتمہ
کر ڈالے۔ وہ اپنی بیس سالہ زندگی کے اوراق الٹنے لگی۔ اسے اس کتاب کے
سارے ورق سیاہ دھبوں سے لپے نظر آئے۔ اسکے دل میں آیا وہ ان سیاہ کاغذوں
کو نوچ کر جلا دے اور اس کتاب کا ایک نیا باب شروع کرے جو پاک و سفید ہو۔
جیسے مریم کی کنواری بیٹیوں کا گاؤں ـــــ ٹاور نے بارہ بجنے کا اعلان کیا۔ وہ ایکبار
پھر چونک اٹھی۔ پیٹ میں آگ سی سلگ رہی تھی۔ اور وہ دھب سے بستر پر گر پڑی
تکیہ میں منہ دیئے وہ سسکتی رہی۔ کمرے میں لمحہ بھر کیلئے سکوت چھا گیا ـــــ
یکبارگی "نیلم" اچھل پڑی۔ جیسے کوئی سنہرا سپنا دیکھا ہو۔ دوڑی ہوئی آئینہ کے پاس
آئی۔ اسنے دیکھا اسکی بیس سالہ کتابِ زندگی کے دھبوں میں بھرے اوراق میں
ایک نئے سفید اور پاک ورق کا اضافہ۔ اس کا دل چاہا وہ اس گھناؤنی فضا سے
پرواز کر جائے تاکہ اسکی زندگی کے بقیہ صفحات اسی طرح گناہوں کے داغوں سے
پاک اور صاف رہیں ـــــ لیکن ساتھ ہی اسکے پیٹ کی آگ ان سفیدیوں کو جھلس
دینے پر تلی تھی۔ اسی لمحہ بڑھیا امید افزا چہرے سے کمرے میں داخل ہوئی "نیلم ... بٹیا"
اور نیلم نے آئینہ پر سے چہرہ گھوما کر "بوا" کی طرف کر دیا۔ لیکن فوراً ہی تاڑ گئی وہ بوڑھی کے
دل کی بات جان گئی "شاید کوئی بھولا بھٹکا اسوقت آگیا ہو" اسے معلوم ہوا جیسے

کسی نے اسکے پیٹ کی آگ پر مٹی کا تیل چھڑک دیا ہو۔ اور شعلے لپک لپک کر
اس ننھے اور سفید ورق کو اپنی لپیٹ میں لے آنا چاہتے ہوں۔ اس کے قدم ڈگمگانے
لگے۔ لیکن فوراً ہی وہ چیختی ہوئی کمرے میں بند ہو گئی۔ وہ کسی بھی قیمت پر اس ننھے
سفید اور پاک ورق کو ہاتھ سے جانے دینا نہ چاہتی تھی۔ جس کا جنم اسکی گناہ آلود
زندگی میں خوش قسمتی سے خود بخود ہو رہا تھا۔ بوڑھی دروازہ کھٹکھٹاتی رہی لیکن نیلم
کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ نہیں آج نہیں۔۔۔۔!"

وہ جنتیں جو کھو گئیں

شام کے ساڑھے سات بجے سے نو بجے تک میں یہ کوشش کر کے تھک گیا کہ
اپنے دماغ کو پوری سنجیدگی اور انہماک سے پڑھنے میں لگا سکوں. لیکن جیسے
دماغ سے یہ بات رہ رہ کر غائب ہو جاتی تھی کہ فروری اور مئی کے درمیان کوئی
سال دو سال کا وقفہ نہیں ہے. مئی میں ہونے والے امتحان میں کامیاب
ہونے کے لیے سامنے شلف میں لگی ہوئی ساری کتابوں کو پڑھ کر یاد بھی کر لینا
ضروری ہے۔ اور زندگی کو میاب بنانے کے لئے امتحان میں کامیاب ہونا ضروری
ہے. کیونکہ زندگی اگر کامیاب نہیں ہوتی تو دنیا نہیں سنورتی۔ اور عاقبت
سنوارنے کی فکر دھری رہ جاتی ہے۔ اور زندگی کسی دم توڑتے چراغ کی پیاسی
لو کی طرح تھر تھراتی رہ جاتی ہے۔

لیکن ان تمام خیالات اور احساسات کے باوجود دماغ جلد جلد فیوز
ہو جانے والی بجلی کی طرح بیچ بیچ میں آف ہو جاتا تھا. تنگ آ کر میں نے تنقید کی
موٹی اور خشک کتابوں کو بند کر دیا۔ اور سامنے "ڈن" کی نظموں کا مجموعہ کھول کر
رکھ دیا. لیکن ایک نظم.... دو.... جی نہیں! دوسری نظم کے ابتدا ہی
میں ذہن بھی غالباً سترہویں صدی میں پہونچ گیا اور جب طبیعت اس میں بھی
نہ لگی تو میں نے گرم گرم بستر کو ذرا للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر اس پر

دراز ہو کر "ملٹن" کی "فردوس گم شدہ" ہاتھ میں لے لیا۔

"ملٹن" واقعی ایک عظیم شاعر تھا"۔

میں نے اس کتاب کی ایک ہی سطر پڑھی تھی۔ اور لحاف سے منہ ڈھک کر میں ملٹن کی عظمت کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کی بے نور آنکھوں اور روشن دماغ کے بارے میں سوچنے لگا۔

کھٹ! کھٹ!،

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی میرے ذہن کے دروازہ پر دستک دے رہا ہو۔

"تم نے مجھے پہچانا۔؟"

"نہیں۔۔۔۔ نہیں تو!" دراصل میں انہیں نہیں پہچان رہا تھا۔

"اچھا تو شائد تم اس مولوی صاحب کو پہچان سکو"۔

ارے! تم! صلاح الدین! ___ اور۔۔۔۔۔ اور تم! تمہیں بھی پہچان لیا ہے میں نے۔ لونگ بھیا چلا ہے جھاتا تان تان کے"۔

"ارے واہ! تم نے سچ سچ ہمیں پہچان لیا!"

لیکن اتنے دنوں بعد ___ کہاں ہو کیسے ہو۔؟"

"میں تو یہ پوچھنے آیا تھا کہ قلم سے لکھ کر رسالہ نکالتے وقت تو تمہیں بڑی ضرورت تھی۔ لیکن جب تم نے چھپوا کر رسالہ نکالا تو ایم۔ صلاح الدین عرفان عظیم آبادی کو بھول گئے۔؟"

میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ کچھ بولنا چاہتا تھا کہ "خان" بیچ میں ٹپک پڑا۔

"یار! یہ تمہارا کلاس"۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا

"ہاں ہاں! تمہارا ہی ہے۔" خاں بہادرؔ کی ریہرسل کے زمانے میں تمہارے کمرے سے گلاس غائب آخر کس نے کیا تھا!"

"خاں بہادرؔ ــــ وہ ڈرامہ جس میں میں ہیروئن بنا تھا اور جب کہ لڑکی کے میک اپ میں اپنی شکل آئینہ میں دیکھ کر میں یہ سوچ بیٹھا تھا کہ کاش میں لڑکی ہی ہوتا۔

اور میں اپنے اسکول کے زمانہ میں کھیلے ہوئے ڈرامہ کا ایک سین دیکھنے لگا، اور اتنے میں میرے دوست آہستہ سے کھسک گئے۔ میں نے دروازہ سے باہر جھانک کر دیکھا۔ لیکن ان دونوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔

البتہ باہر بارش ہو رہی تھی۔ اور املی کے درختوں کے جھنڈ کے پیچھے بارش میں بھیگتا کوئی آ رہا تھا۔ نہیں کوئی کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ ایک چھتری اور دو بھیگنے والے!

لڑکی نے کہا۔

"تم اپنی کتابیں مجھے دے دو۔ اور لو یہ چھتری تم پکڑ لو۔"

لڑکی نے کہا۔

"نہیں۔ تم اپنے ساتھ ساتھ کتابوں کو بھی شرابور کر ڈالو گی۔ تم ہی چھتری لگائے رکھو۔"

لڑکی اس بار بگڑ کر بولی۔

کہ "نائیں! ایسا ہو بے نا۔ یو ٹا کے آما کے دیئے داؤ۔"

لڑکے نے کہا۔

"نئے نا ذبابا! تما کے کے ادکھچو بولتے پارے کی!"

اور پھر مجھے اپنے آپ پر ہنسی آگئی۔ لڑکپن میں میں کتنی اچھی بنگلہ بول لیتا تھا۔ اور اب چاہوں بھی تو ایک لفظ منہ سے نہیں نکلتا۔

ارے توبہ! میں کہاں چلا آیا۔ میں پڑھ رہا تھا۔ ملٹن کی فردوس گم شدہ۔ ملٹن کی شاعری۔

"REGIONS OF SORROW, DOLEFUL
SHADES WHERE PEACE
AND REST CAN NEVER DWELL, HOPE
NEVER COMES
THAT COMES TO ALL"

میں بھول گیا کہ میں ملٹن کے اشعار پڑھ رہا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے یہ دنیا سچ مچ غم و الم کی پرچھائی ہو۔ جہاں سکون و آرام کا گذر۔ اُمید کی رمق۔ آرزو کی کرن کا نام نہ ہو ـــــ لیکن دنیا صرف دوزخ کا نمونہ ہی تو نہیں

دنیا جنت بھی تو ہے۔

جہاں ساون کی گھٹائیں جلترنگ بجاتی ہیں۔ جہاں تمناؤں کے پھول مسکراتے ہیں۔ جہاں آرزوؤں کی پازیب کھنکتی ہے۔ جہاں چاند، رات کی مخملی زلفوں میں کہکشاں کی کلیاں گوندھ آتا ہے۔ جہاں......

لیکن کون جانے یہ جنّت کسے ملتی ہے۔ اور کسے نہیں ملتی۔؟

میں اندر آسکتی ہوں۔

"جی! جی نہیں میرا امتحان مئی کے دوسری تاریخ سے ہے۔ اور مجھے جلد

جلد ان ساری کتابوں کو ختم کر لینا ہے۔ پھر ان پر تنقیدیں پڑھنی ہیں۔ یہ کمبخت مصنف اور شاعر بھی تو کم عذاب نہیں ہوتے۔ واہیات خرافات لکھ کر چھوڑ جاتے ہیں۔ اور سر کھپانا پڑتا ہے ہم لوگوں کو۔ ورنہ امتحان پاس کر لینا کتنا سہل ہو جاتا۔ اور امتحان۔ یہ دنیا۔ یہ جنت!!"

"ہی... ہی... ہی!" کوئی نقرئی قہقہہ فضا میں بکھر گیا۔

"آپ اب تک ان باتوں کو سوچتے ہیں۔ آخر افسانہ نگار ہیں نا! چمکتی ہوئی حقیقت پا کر بھی افسانوں کے دھندلکوں میں بھٹکتے ہیں"۔

"جی۔ میں.... میں نے آپ کو پہچانا نہیں"۔

"آپ مجھے پہچان کر کیا کریں گے۔ بہت سی صورتیں ایسی ہوتی ہیں جو بعد میں پہچانی بھی نہیں جاتیں — ویسے میں کرن کی شکل ہوں۔ چاندنی کی مورت ہوں"۔

"تم رخشو!"

"ہاں! جس نے ایک اور صرف ایک افسانہ لکھا تھا۔ جسے آپ پڑھ کر چونک گئے تھے۔ ڈر گئے تھے"۔

"رات میں آپ کے کمرے میں چپکے سے گئی۔ آپ کی بڑی سی تصویر دیوار سے لگی مسکرا رہی تھی۔ آپ اپنے بستر پر بہت گہری نیند سے سو رہے تھے۔ میں نے کرسی کھسکا کر دیوار سے قریب کی اور چپ چاپ کرسی پر چڑھ کر وہ تصویر اتار لی — میں نے سوچا آپ سے تصویر مانگتے مانگتے میری عمر بھی ختم ہو جاتی۔ تو آپ اپنی تصویر مجھے نہ دیتے۔ لیکن اب — لیکن جب میں تصویر لے کر مڑی تو میرے پاؤں نے کسی چیز سے ٹھوکر کھائی اور ..... اور آپ کی

نہیں میری آنکھ کھل گئی۔ پر میرے خواب بکھر گئے۔ میرے سپنے بادل بن کر اڑ گئے۔

"رخشو! یہ تو سچ مچ ایک افسانہ تھا۔ ایک خواب! لیکن اس افسانہ کے پیچھے تم خود کیوں ایک افسانہ بن گئیں — راشد الخیری کا افسانہ!

لیکن رخشو چلی گئی۔ اس نے مڑ کر کوئی جواب نہیں دیا۔

اور جب رخشو چلی گئی تو میری آنکھوں کے سامنے پھر موٹی موٹی کتابیں آ گئیں۔ اور کتابوں نے جیسے مجھ سے کہا ہم نے دنیا کو جنت بنانے کا راز اپنے اندر چھپا رکھا ہے۔ اور میں نے سوچا کہ کتنی جھوٹی ہیں یہ کتابیں!

کتابوں سے سب کو روٹیاں کہاں ملتی ہیں۔ کتابوں سے عالیشان بنگلے کہاں ملتے ہیں۔ کتابوں سے تاج محل کہاں بنتا ہے۔ کتابوں سے..........

اور دیوار پر لگی ہوئی "شیلی" کی تصویر نے جیسے میرے خیال کی تقویت کر دی۔

"I FALL UPON THE THORNS OF
LIFF, I BLEID."

[illegible] اور شیلی تو ایک قنوطی شاعر تھا۔ حقیقت سے فرار ڈھونڈنے والا — میں نے تلخی سے کہا۔ اور پھر جیسے میرے کانوں میں کوئی گنگنا گیا۔

"حیات نام اجل بھی ہے سادہ صرف غم تو نہیں"

اور شاعر بڑی لگن سے اپنی نوخیز امید دل کے ایوان میں قندیلیں روشن کرنے لگا۔ میں نے چاہا اب اس ایوان میں اپنی نئی تمناؤں کے نا تراشیدہ اصنام سجاؤں — کہ.... پھر یادوں کی تاریک رات میں کسی مدھم سے ستارے نے آنکھ جھپکائی۔ پھر نیلا آکاش ستاروں سے

بھر گیا۔ چاند نے ساری فضا پر پگھلی ہوئی چاندنی پھیلا دی۔ اور۔۔۔۔۔

ٹن۔ ٹن۔ ٹن!

"تین بج گئے؟"

"ہوں۔ تو کیا ہوا؟"

"تمہارا بچپنا نہیں گیا۔ ابھی تک ٹافیوں کے لئے مچلتے ہو۔"

"میں سوچتا ہوں موتی! یہ پونم کا چاند۔ یہ ستارے۔ رات اور شبنم کے موتی۔ فضا کا مدہوش کن سناٹا۔ ترنم۔ اور ہم اور تم — کاش وقت کا تیز چکر رک جاتا اور یہ گھڑی امر ہو جاتی۔"

پھر جیسے کوئی سوتے میں سپنا دیکھنے لگے۔

"لیکن ایسا نہیں ہو گا۔ ایسا نہیں ہوتا ہے — یہ بھی جانتی ہوں۔ اور تم بھی — چلو بہت دیر ہو گئی۔"

جیسے خوابوں کا شیش محل چور چور ہو جائے

"ہاں!"

"لیکن یہ کیا؟ تم نے یہ ٹافی اٹھا کر جیب میں کیوں رکھ لی؟ تمہیں ٹافیاں مجھ سے زیادہ پسند ہیں کیا؟"

"نہیں موتی! چاند کو جب اندھیرا نگل لے گا۔ اس ٹھنڈی رات کے کومل ماتھے پر پسینہ آ جائے گا۔ جب یہ سپنا بکھر جائے گا۔ جب جیون کوئی اور نیا خواب دیکھنا شروع کرنے دے گا۔ اس وقت اس ٹافی کو دیکھ کر میں اس رات کو تو یاد کر سکوں گا۔"

یاد — ! یاد تو بہت سی باتیں آتی ہیں۔ جیسے مجھے بالکل یاد تھا کہ

امتحان ایک دم قریب ہے۔ اور مجھے یہ بھی یاد تھا کہ اس آخری امتحان میں کامیاب ہونا میرے لئے کتنا ضروری ہے۔ اور مجھے یہ بھی یاد تھا کہ اپنے لئے اور اپنے ساتھ کسی اور کے لئے زندگی کی روزمرہ ضرورتوں کے لئے مجھے کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ صرف سوچنے اور خواب دیکھنے سے کیا ہوتا ہے۔

لیکن۔

پھر وہی سوچ کا صحرا۔ پھر وہی یادوں کے غزال۔

کوئی جانی پہچانی آواز آئی

"تمہیں نے درد دیا ہے تمہیں دوا دینا۔"

"اوہ! تم زکی!"

"ہاں! تم نے وہ فلم دیکھی ہے جس میں ہیرو یہ گانا.........

ارے یار! تمہارے کمرے میں یہ کرشن اور رادھا کی مورتی یہ کیا معاملہ ہے۔؟"

"تم کسی فلم کی بات کر رہے تھے نا"؟

"چھوڑو، اسے مجھے بتاؤ۔ یہ کیا ہے؟"

"ہولی کا تحفہ!"

"گرینڈ۔ آئیڈیل۔ اور تم نے تو بس ٹائیوں پہ اکتفا کی ہوگی؟

"نہیں وہ بھی نہیں۔ لیکن مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم اسے افسانہ

ڈبنا دو — اور میں رسوا ہو جاؤں"۔

ہت! تم نے سنا نہیں۔ میری مراد ایک علاد شعر سے ہے ؎

تم نے کتنے عشق کئے ہیں عشق کی یہ توہین نہیں۔
کو ہکنی سے سے خواری تک عشق ہمیشہ رسوا رسوا"

اور پھر اس کا افسانہ کیا بنے گا۔ وہ تو ہے بالکل میرا بائی کا بچن۔ نہ آج کل کے عشق کے قابل اور نہ شادی کے۔۔۔!"

شادی —!

شادی ایک حسین لفظ ہے۔ جس کے معنی بھی حسین اور خطرناک ہیں۔

شادی زندگی کا سب سے حسین اور پیارا تصور ہے۔ ایک ایسا خیال ہے جو ہمکتے ہوئے بچے کے ساتھ ساتھ والدین کے ذہن میں کروٹیں لینے لگتا ہے۔ اور جب وہ بچہ خود جوان ہو جاتا ہے تو اس وقت تخیل کی یہ ہمکتی ہوئی جوت اس کے ذہن میں منتقل ہو جاتی ہے۔

اور ذہن میں ہر دم کوئی مدھم سُروں میں
"کاہے بیاہی مورے بابل بدیس،"

کا رس بھرا گیت بچلتا رہتا ہے۔ اور شہنائیاں بجتی رہتی ہیں۔ اور باپ کی شاد کام تمناؤں کے پھولوں ماں کی دہکتی ہوئی خوشبوؤں کے قمقموں سے براتے سجنے لگتی ہے۔

اور دولہا پھولوں سے لدا۔ خوشبوؤں میں اور سہرے کی لڑیوں کے چلمن سے دیکھ رہا ہے سامنے دلہا نے نشاط کے نشہ میں رشادہ دلہن کی دھڑکنوں کے نغمہ پہ جھومتا۔ اس گل دلہن کو کنج میں قدم

رکھتا ہے۔ جہاں بہاروں کی شاہزادی، اپنی کنواری تمناؤں اپنی دوشیزہ دھڑکنوں کے ساتھ دل میں ایک میٹھی سی خلش لیئے اور ایک عجیب خوف دکیف کے ہم آہنگ جذبے کے بوجھ تلے دبی، سکڑی اور سہمی بیٹھی ہوتی ہے۔ تو۔

اور ہاں جب ..... تو اس کمرے کی نکہت بیز فضا نے اس کا خیر مقدم کیا تھا جیسے اور جوہی کے پھولوں سے مسکرا کر کہا تھا۔" یہ کمرہ میرا ہے۔" خوشبوؤں کا ہے"! اور اس نے محسوس کیا تھا جیسے سچ مچ اس کمرے میں رنگ و نکہت کی بہار بے خزاں مسکرا رہی ہو۔ اور جب وہ اپنے دل کے ہزاروں گل بداماں ولولوں کے پیغام لے کر خوشبوؤں کی شاہزادی کی طرف بڑھا۔ تو اسے ستاروں بھرے گھونگھٹ کے پیچھے ترم و حیا کی سرخ شراب سے لبریز چھلکتے ہوئے سے دو پیمانے نظر آئے۔ اور وہ جھوم کر آنکھوں ہی آنکھوں سے وہ شراب پی گیا۔ جیسے وہ شراب مرہم زخم جگر ہو۔ اور مسیحا ہو۔ اور جب اس نے قریب بیٹھ کر مہندی رچی مخروطی انگلیوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ تو اس کے دل کے نہ جانے کتنے تار ٹوٹ گئے۔ اور ان انگلیوں نے ایک خوابیدہ نغمے کو وہاں چھیڑ دیا۔ — اور پھر نغموں سے نغمے ملے۔ آنکھوں سے آنکھیں ملیں۔ اور شمع سے شمع جلی۔ تو رات چپکے سے سو گئی۔ پھولوں نے اپنی آنکھیں موند لیں .....

اور — ؟

اور نہ رات سو گئی تھی۔ اور نہ کلیوں نے آنکھیں موندی تھیں۔ بلکہ وہ

تو اسی طرح شلف میں لگی ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

اور میں ماضی کے دھندلکوں میں ڈوب جانے والے ان لمحات کو دیکھ رہا تھا جو ڈوب کر پھر کبھی نہیں ابھرتے۔ اور اپنی کھوئی ہوئی جنتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ دنیا کے جھمیلوں سے الگ زندگی اگر کچھ اور نہ ہوتی تو صرف یاد ہوتی ـــــ خوبصورت یاد! کاش!

———
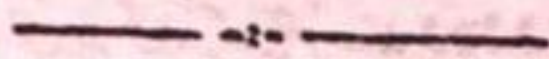
لبِ یار کی خوشبو

اور اُسے یہاں بھی شانتی نہ ملی۔ جس چیز سے وہ دور بھاگا پھر رہا تھا اس نے اس کا پیچھا یہاں بھی نہ چھوڑا تھا۔ مندر کی پاک اور پرسکون فضاؤں میں وہ خیال اس کے گرد منڈلا رہا تھا۔ گھنٹوں کی آواز کی بازگشت میں اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی جانی پہچانی نغمہ ریز آواز اس کا پیچھا کر رہی ہو۔ دھوپ اور عود کی خوشبو اور بھگوان پر چڑھائے ہوئے پھلوں اور پھولوں کی تیز بُو کے دبیز پردے کو چاک کر کے وہ جانی پہچانی خوشبو اس کے سارے وجود پر چھائی جاتی محسوس ہوتی اور اس کا جسم کانپنے لگتا۔ اس کی آنکھیں جلنے لگتیں۔ کرشن کی مورتی اسے نظر نہ آتی۔ اس کی آنکھوں میں بس صرف رادھا سمائی رہتی۔ بھگوان شیو اُسکی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے اور وہ صرف پاربتی کو اپنے سامنے پاتا۔

ہر روز کی طرح اس روز بھی جب اُس نے پوجا ختم کر کے آنکھیں کھولیں تو نیلما کو اپنی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے پایا۔ اس بار اس نے اسے جھنجھلا کر ٹوک دیا۔

"نیلما! بھگوان یہاں میری آنکھوں میں نہیں براجتے"

بھگوان کہاں نہیں براجتے یہ تو تلاش کرنے والے کی قسمت ہے۔ اُسے

پربھو جہاں مل جائیں؟"

نیلما نے اپنی آنکھیں جھپکائے بغیر کہا۔

اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی ساری بھگتی، ساری تپسیا نیلما کی

نیلی آنکھوں کی گہری جھیلوں میں بہہ جائے گی۔

نیلما نے پھلوں اور مٹھائیوں سے بھری تھالی اس کی طرف بڑھا دی

"کنول جی! کبھی تو داسی کی بھینٹ سویکار کر لیجئے۔"

"نیل...!" نہ جانے کیوں وہ اس کا پورا نام نہ ادا کر سکا۔

"بھینٹ تو بھگوان سویکار کرتے ہیں۔ میں انسان ہوں —— انسان

انسان کی بھینٹ کیا سویکار کرے گا؟"

نیلما نے کہا "کنول جی! میں اور تو کچھ نہیں جانتی۔ لیکن اس سے تو آپ بھی

انکار نہ کریں گے کہ انسان ہمیشہ کا دل تو نہیں توڑتا!"

دل کی بات تو ڈاکٹر جانیں یا شاعر۔ میں تو ایک معمولی انسان ہوں۔ ایک

معمولی پجاری!"

نیلما ہنس پڑی اور کنول کو ایسا محسوس ہوا جیسے مندر کی ساری گھنٹیاں

بج اٹھی ہوں۔

"تم کیسے بھگت ہو کنول! یہ بھی نہیں جانتے کہ دل ہی وہ مندر ہے جس میں

بھگوان براجتے ہیں —— میرے دل کا مندر بہت دنوں سے سونا تھا لیکن میرا

کو پربھو مل گئے ہیں۔"

نیلما آنکھیں بند کر کے بھجن گانے لگی۔

اور کنول اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اسے دیکھتا رہا اور نیلما

کے لب ہلتے رہے اور اس کے لب کی ہر جنبش پر کنول کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اُس کے جسم پر سے اس کی خود لادی ہوئی پاکیزگی، پوترتا اور بھگتی کی ساری پرتیں اکھڑنے لگی ہیں۔ اور گیروے رنگ کے کپڑے میں لپٹے ہوئے کنول سے دور کوئی اور کنول کھڑا مسکرا رہا ہو۔

"تم کنول نہیں ہو سکتے۔ تم تو وہی تاج ہو اور یہ نیلما نہیں۔ یہ مونی ہے اور یہ لب مشکبو مونی ہی کے لب ہیں جنھیں تم ایک بار چوم چکے ہو۔"

اور تاج اپنے ہمزاد کنول کو اسی مندر کی چہار دیواری میں گم کر کے وہاں سے بھاگ گیا۔ ٹرین میں بیٹھا ہوا وہ سوچ رہا تھا۔

نیلما کا من مندر پھر سونا ہو گیا ہو گا۔

کون جانے میرا کو پھر پرچھائیں ملے گی یا نہیں؟

نیلما کی تھال کا پرشاد کون سویکار کرے گا۔

"نیلما... نیلما... نیلما..."

اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

نیلما کا چکر۔ مونی کا چکر اور نہ جانے کس کس کا چکر۔ ان چکروں سے تم کبھی نکل بھی سکو گے۔ نیلما مونی ہے اور مونی نیلما —— سارا چکر ایک ہی ہے۔

اور ٹرین بھاگتی جا رہی تھی اور وہ بھاگا جا رہا تھا۔ بھاگتا جا رہا تھا۔ نجات کی تلاش میں۔ شانتی کی جستجو میں!

اور پھر یوں ہوا کہ خداوند خدا نے ایک کبوتر آسمان سے کنواری مریم کے پاس بھیجا اور وہ روح القدس سے بھر گئی۔" تاج کے کانوں سے یہ آواز ٹکرائی

اور اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے کمپارٹمنٹ کے ایک گوشے میں مسیحی راہبوں اور راہبات کے گروہ کی ایک راہبہ سفید بے داغ لبادہ میں ملبوس، گلے سے نقرئی صلیب کی زنجیر لٹکائے، اپنے سارے وجود پر ایک ملکوتی وقار ڈھالے، اپنی گوری پیشانی پر فرشتوں کی تقدیس کا نور لئے کہہ رہی تھی۔

"خداوند خدا کے مقدس بیٹے نے فرمایا کہ اس زمین پر رہنے والے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے نجات کا ایک ہی راستہ ہے۔۔"

اور تاج کے دل میں جیسے اس راہبہ کی بات گھر کر گئی۔ وہ نجات کا راستہ ہی تو ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے اس کے لئے گھر چھوڑا۔ بن اپنایا۔ گوتم بنا۔ دیوی دیوتاؤں کی پرستش کی۔ لیکن کسی سے اسے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ نہ مل سکا۔ اتنے دنوں کی کاوش اور کتنی راہوں پر بھٹکنے کے بعد اسے نیلما ملی جو مایا کا ایک اور پرکشش روپ تھی اور ترغیب گناہ کی دوسری شکل!

وہ جہاں سے بھاگا تھا پھر وہیں آکر پھنس گیا تھا۔

اور وہ مسیحی راہبوں کے اس گروہ میں شامل ہو گیا۔

بپتیسمہ کے بعد ایزابیلا نے تاج سے کہا۔

"تاج جیکب! اس سے پہلے کہ تم خداوند خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے قابل بن سکو تمہیں چاہئے کہ تم اپنے گناہوں کو اس کے سامنے CONFESS کرو۔ کنفیشن کے بعد تمہاری روح مقدس کبوتر کے پر دں کی طرح دھل کر صاف و شفاف ہو جائے گی۔"

تاج پہلے ایزابیلا ہی کی باتیں سن کر متاثر ہوا تھا اور تاج جیکب بن گیا تھا۔ اس لئے اس نے ایزابیلا کے اس مشورہ کو بہت غور سے سُنا۔

وہ کنفیشن کے نفسیاتی ردِ عمل اور سکون بخشنے والے اثرات کے متعلق پہلے بھی پڑھ چکا تھا اور تاج جیکب جبکہ محمد تاج تھا، اس نے جنوری کی ایک یخ بستہ رات کو اپنے محلے کی اندھیری مسجد میں تنہا کھڑے ہو کر نمازِ توبہ پڑھی تھی اور یہ دعا مانگی تھی کہ اے خدا! میرے گناہ معاف کر دے۔ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ نہ معلوم کون سی ایسی طاقت تھی۔ کیسے کہوں خدائی سے بھی بڑی جس نے مجھے بالکل بے ہوش کر دیا اور میرے لب۔۔۔

اور پھر تاج جیکب نے اس وقت بھی اپنے ارد گرد اُسی جانی پہچانی خوشبو کی لپٹیں محسوس کیں اور اس نے جلدی سے ہاتھوں سے صلیب کا نشان بنا کر آنکھیں بند کر لیں اور اس کے لب آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگے۔

"میں ایک مُلّا کا بیٹا۔ داڑھی اور تسبیح کے سائے میں پلا پروان چڑھا ہوش سنبھالا تو قرآن شریف کا حافظ ہو چکا تھا۔ حدیث اور فقہ کی تعلیم کے بعد انگریزی پڑھی تو بس اس تصور کے ساتھ کہ علم حاصل کرنا گناہ نہیں۔ پھر گھر کا ماحول بھی ایسا سخت قسم کا مذہبی تھا کہ ہر طرف مسجد کے ممبر اور محراب ہی نظر آتے اور ہر جگہ لوبان کی مقدس خوشبو فضا میں تیرتی ہوئی معلوم ہوتی۔

لیکن اُس کے ابرو کے محرابوں کے نیچے میرا دل جو گلے میں ڈالے ہوئے سیاہ سے تعویذ کے نیچے ہمیشہ دبا رہتا تھا، سجدہ کرنے کے لئے بے قرار رہنے لگا۔

اور پھر میں اس کی محبت پر پوری طرح ایمان لے آیا۔ اس کی آنکھوں کے مسحور کن اشاروں نے مجھے بیخود کر ڈالا اور میں اس کی طرف کھنچتا گیا اور پھر اس کے لبوں کو ایک سرد سی رات میں۔۔۔

تاج حبیب نے گھبرا کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے سوچا یہ من واقعی بہت پاپی ہے۔ کسی لمحہ دور نہیں ہوتی اس لب مشکبو کی یاد!

تو مجھے معاف کر میرے خدا! میرے خیال کی رَو پھر بہک گئی تھی۔ ہاں تو اس رات جب میں اس کی محبت پر پوری طرح ایمان لا کر واپس آیا تو اپنی بوڑھی ماں کو نماز میں غرق پایا۔ اس قدر غرق کہ اُسے میرے آنے تک کی خبر نہ ہوئی تھی اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس کافر دل نے بغاوت کر دی۔

"یہ گناہ ہے!"

میں نے نمازِ توبہ پڑھی۔ دل ہی نے دل سے کہا۔ ترا دل تو ہے صنم آشنا۔۔

اور دوسری صبح محلے والوں کے تیور کچھ بگڑے بگڑے نظر آئے۔ عشق ہمیشہ کی طرح رسوا ہو چکا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ پنچایت میرے لئے کوئی سزا تجویز کرتی میں گھر چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

گھر چھوٹ گیا۔ باپ ماں چھوٹ گئے۔ لیکن ایک یاد تھی اس لب مشکبو کی جو دل کا دامن چھوڑتی ہی نہ تھی۔

شہر شہر مارا پھرا۔ دنیا کے جھمیلوں میں گھرا۔ لیکن ایک خیال تھا کہ جاتا ہی نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میرا سارا وجود اس خوشبو میں نہایا ہوا ہے۔

پھر شاید میں موتی کو بھول گیا۔ اس کے خد و خال بھی اب تصور کے پردے پر نہیں آتے لیکن وہ عجیب و غریب خوشبو! وہ کسی طرح دل کا دامن نہیں چھوڑتی۔

پھر شہر چھوڑا بن اپنایا اور وہاں جو تھوڑی سی شانتی ملی تو میں تاج سے کنول ہو گیا۔

اور پھر عرصے کی تپسیا کے بعد بھی جب سکون نہ ملا اور میں نے محسوس

کیا کریں وہیں پر ہوں جہاں سے چلا تھا۔ تو میں اب تاج جیکب ہو گیا ہوں۔

"میں تاج جیکب۔ ایک کمزور ناتواں انسان! یسوع مسیح مجھے اتنی طاقت دیجئے کہ میں۔۔۔"

تاج جیکب نے آنکھیں کھول دیں۔ صلیب کے نیچے نقرئی شمع دان میں رکھی شمع اس کی داستان سنتے سنتے تھک چکی تھی اور دیوار سے آویزاں صلیب انسان کی ازلی کمزوری پر مسکرا رہی تھی۔

اور تاج جیکب کا خود مختار دل اپنی مجبوری پر رو رہا تھا۔

"جو چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں۔"

پانچ کرسمس گزر گئے تھے اور چھٹے کرسمس کی تیاریوں میں مسیحی راہبوں کا پورا گروہ مشغول تھا۔

بڑے پادری نے پوچھا "تاج اور ایزا بیلا نظر نہیں آتے؟"

کسی نے جواب دیا۔ "دونوں صبح سے ہی نظر نہیں آتے۔"

"ہوں!" بڑے پادری کی خاموشی بہت معنی خیز تھی۔

لیکن اسی شام ایزا بیلا بہت ہی گھبرائی ہوئی بڑے پادری کے پاس آئی۔ بہت ادب سے اس کے قریب بیٹھ کر ایزا بیلا نے کہا۔

"مقدس باپ کی قسم! میں اِدھر کچھ دنوں سے ایک عجیب بات دیکھ رہی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا اس کا کیا مطلب ہے اور کیا ہونے والا ہے؟"

"کیا؟"

ایزا بیلا نے اپنے دل کے پاس آویزاں طلائی صلیب کو اٹھا کر دکھاتے

ہوئے کہا۔

میری آنکھوں کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ میں یہ دیکھتی ہوں کہ تاج جیکب میری اس صلیب سے جکڑ دیا گیا ہے۔۔۔ اور۔۔۔ میں اسکے خون کے قطروں سے نہا گئی ہوں۔"

بڑے پادری کی آنکھیں یہ سن کر پھٹی رہ گئیں۔ اس نے صرف یہ کہکر ایزابیلا کو رخصت کر دیا۔

"تم سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے۔ ابھی جاؤ۔ میں سوچ کر جواب دوں گا۔"

اور ایزابیلا کے وہاں سے جانے کے بعد ہی تاج جیکب وہاں آ گیا۔

بڑے پادری نے پوچھا: "کہاں تھے تم؟"

"میں اور ایزابیلا۔۔۔"

بڑے پادری کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور اس نے تاج جیکب کو اپنی بات بھی پوری نہ کرنے دی۔

"مجھے سب معلوم ہے۔ تم اسی راستے پر جا رہے ہو جو ازل سے ممنوع ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" جیکب پھر بول پڑا۔ "لیکن اس کے باوجود ——— میں کیا کروں آخر؟"

بڑے پادری نے کہا: "میں خود سوچ رہا ہوں کہ میں تم دونوں کے متعلق کیا کروں۔ تمہارے اطوار اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ تم دونوں کو اس مقدس چہار دیواری میں رہنے دیا جائے۔"

اور اس سے پہلے کہ کرسمس کی صبح کا آفتاب طلوع ہو کر ——— آراستہ چرچ اور اس سے متعلق عمارتوں پر اپنی اولین کرنیں نچھاور کرتا، تاج اور

ایزابیلا دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے اس پہاڑی سے نیچے اتر گئے جس پر وہ مقدس عمارت تھی اور اس مقدس عمارت کی کھڑکیوں سے بہت سی آنکھوں نے آدم اور حوّا کو ایک بار پھر جنت کو ٹھکرا کر جاتے ہوئے دیکھا!!

سوا نیزہ پر لٹکا ہوا آدمی

وہ سوا نیزہ پر اطمینان سے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور آفتاب نیچے زمین پر سر جھکائے کھڑا تھا۔

"ہلو"

ہلو۔ ہلو"

تم چاہو تو کھانے کے لئے گھر تنہا چلی جا سکتی ہو۔ میرا آج اپریشن ڈے ہے۔ مجھے دیر لگے گی۔"

سامنے سے ایک جیپ آئی جس کے ونڈ اسکرین پر لال مثلث بنا ہوا تھا اور ایک ٹھونٹ موٹنٹ اور بے برگ و بار درخت کے نیچے آ کر رک گئی۔

درخت کے آنسو جیپ پر گرنے لگے۔

"کیا تم مجھے وہ دے سکتی ہو جس کی آرزو میری زندگی ہے اور جس کی تمنا اب ایک مہیب خواب کی صورت بن گئی ہے۔"

اشکوں کی زبان جل ترنگ بجاتی خاموشی میں ڈوب گئی اور جیپ وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ کرشن ایک بڑھتی ہوئی قوت ہے اور لمحات

اور ساعتیں محض سسکیاں، اور یہاں اور وہاں کے درمیان کی بے نام کڑیاں۔

وقت کی پتھرائی ہوئی آنکھ نے دیکھا کہ آفتاب جو کچھ دیر قبل کھڑا زمین پر اونگھ رہا تھا، اپنے قدم سفر پر بڑھا چکا ہے۔

اور وہ بھی اسی طرح آلتی پالتی مارے، خاموش، گیان کی چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔

پھر یادوں کے اہرام سے کسی چہرے نے سر اٹھایا۔

"زلیخا؟"

قلوپطرہ؟

یا وہ؟

اور پھر نہ جانے کتنے ہی انطونی اور یوسف مصر کے بازار میں گھوم گئے۔

قلوپطرہ کو انطونی نہیں مل سکا۔ اور یوسف کو کوئی اندھا کنواں کھا گیا۔

اور اسے......؟

پھر ٹیلی فون بولا۔

"ارے تم ابھی تک آفس ہی میں ہو۔ میں نے کہا نا کہ میں آپریشنوں میں مصروف ہوں۔ میرا انتظار نہ کرو۔"

...... اور اسے اب تک کچھ پتہ نہیں تھا کہ اسے کیا ملا اور کیا نہیں ملا۔

پھر وہ خیال کی نہ جانے کن بھول بھلیوں میں بھٹک گئی۔ نرم نرم کہکشاں

کی پگڈنڈی پر وہ کسی کو ڈھونڈتی رہی. چھم چھم کرتے ایک راج محل کو جہاں چاندنی کے تخت پر اس کے خوابوں کا روپ بیٹھا تھا. خوابوں کی وادی بڑی رنگین تھی، بڑی خوب صورت اور بڑی پرسکون بھی.

اور وہ وہاں سو گئی اور جب تک وہ سوتی رہی محبت کو بھی نیند آگئی۔ اور جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کے تصورات کا راج کمار اس کے سامنے تھا. جب وہ دونوں سنہری جھیل میں محبت کی کشتی پر سوار ہو گئے تو ایک نئے سفر کا آغاز ہوا۔

لیکن اس کے خیالوں کے شہزادہ کو وقت کے جادو نے پتھر کا بنا دیا تھا۔

گیان دھیان کی سیڑھیوں پرسے کسی اُپدیشک نے ایک بار آواز دی تھی۔

"ہر کمال کو زوال ہے"

لیکن یہ کیا کہ یونان پھر سے اپنے ملبہ سے اسی طرح زندہ کھڑا ہو گیا تھا اور اب تو شاید موت کا علاج بھی اس یونان میں دریافت ہو جائے۔

"لیکن موت کہتے کسے ہیں؟"

"اور زندگی کیا ہے؟"

زندگی کو دستاویز کے خاطر تن خاطر علاقات پر ناپنا مجھے نہیں کیوں کہ زندگی چاند کو چھو لینے کا نام ہے۔

پھر موت کیا ہے؟

شاید زندگی کا ہی دوسرا نام

ایک روز نیچہ اور پلیٹ کی موسیقی پر پریشر کوکر میں تیار کیا ہوا کھانا کھاتے ہوئے وہ اسے ان آپریشنوں کے بارے میں بتا رہا تھا جن کی وجہ سے اسے گھر آنے میں اکثر دیر ہو جاتی تھی۔

"ہم لوگ آتم ہتیا نہیں کراتے۔ یہ پلاننگ ہے"

وہ بولی۔ "تم اب ڈاکٹر سے خدا بنتے جا رہے ہو۔"

"ہم لوگ خدا تو نہیں۔ البتہ ان قربنوں سے یہ دنیا جنت بن سکتی ہے۔"

وہ بات کاٹ کر بولی۔

"میں تمہیں شراد کیسے کہوں۔"

اور دیوار کی دوسری طرف دھوئیں اور آگ میں پکائی ہوئی دال، روٹی اور کچی پیاز کھاتے ہوئے آدم کی ایک اور اولاد نے اپنے گھر کی جنت سے پوچھا۔

"دال میں گھی کیوں نہیں ڈالا گیا۔"

جواب بہت ہی معقول ملا۔

"مہینہ کی آخری تاریخ ہے، گھی تمہاری منڈی ہوئی مونچھوں میں رگڑنے کو رکھ چھوڑا ہے۔"

پھر کھانے کی تھالی چھنا کے کے ساتھ دیوار پر دے ماری گئی۔

اور وہ عورت رونے لگی

اور مرد کے غصہ نے دم توڑ دیا۔

"سالی کے آنسوؤں میں میرا غصہ پگھل جاتا ہے۔"

لیکن دیوار کے اس طرف نہ تو آنسوؤں کی آواز پہونچی اور نہ ہی

تھال کے گرنے کی آواز۔ اس طرف دیوار پر لگے کلاک کی ہموار ٹک ٹک
میں سب کچھ ڈوب گیا۔

آفتاب کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

میں رات کو دیر سے واپس آؤں گا۔ تم چاہو تو سینما کا فرسٹ
شو دیکھ آسکتی ہو۔"

"لیکن میں سینما تنہا......"

"تو کیا میں دنیا کے سارے کام چھوڑ کر تمہارے ناز نخرے اٹھاتا پھروں"
اور اس نے کار اسٹارٹ کر دی۔

یہ جواب سن کر ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے، لیکن یہ
حسن کاران آنسوؤں کو تیر کر آسانی سے آگے بڑھ گئی۔

راستہ بھاگتا رہا اور وہ موٹر کا اسٹرنگ پکڑے بیٹھا رہا۔

سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے کسی دھرم آتما نے کہا۔

"رام نام ستیہ ہے۔"

پھر اس نے موٹر بیک کر کے دوسرے راستہ کی طرف موڑ لیا۔

"کون جانے کیا ستیہ ہے اور کیا جھوٹ۔"

کسی کو کیا پڑی ہے۔

اس کیل وستو میں کوئی سدھارتھ پھر سے جنم لے تب نا۔

یا پھر کوئی عیسیٰ۔

یا کوئی محمد کو جاننے اور دیکھنے والا۔

لیکن یہ سچ ہے کہ سچ کو کوئی لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ اور
ایک سچ یہ ہے کہ "تم" تم نہیں ہو۔ اور "وہ" وہ نہیں۔
اور جھوٹ وہ روشنی ہے جو تاریکی کے دل میں دھڑکتی ہے۔
اور دوسرا بڑا سچ یہ ہے ——— جھوٹ یہ ہے کہ جب دوسری سڑک
پر بھی اس کی موٹر کے سامنے ایک گزرتا ہوا جنازہ آ گیا تو غیر ارادی طور پر
اس کا پیر بریک سے جا لگا۔

"تمہاری بہن مر گئی۔"

مولانا وحیدالدین نے کہا جنہیں دنیا اس کا باپ کہتی تھی۔

"اوہ! آج مری۔ حالانکہ میں نے تو ایک ماہ قبل ہی کہہ دیا تھا۔"

اور وہ دل کے ایسے مریضوں کی موت کے اسباب کے متعلق
غور کرنے لگا۔

"آخر اس نے مرنے میں اتنی دیر کیوں لگائی۔"

قبرستان میں وہ قبر تیار ہونے کے انتظار میں کھڑا رہا۔ وقت
گزرتا رہا۔ وقت جو دولت ہے۔ وقت جو ایک طاقت ہے۔

پھر اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھتے ہوئے اکتا کر کہا۔

"اف یہ طریقہ بڑا TIME WASTING ہے۔ اس AGE
میں ......"

"جب تک قبر تیار ہوگی۔ میں کچھ کام کر لوں گا۔ اور اتنی دیر میں
ایک پیالہ گرم کافی بھی تو پیا جا سکتی ہے۔"

اور وہ زندگی اور موت کے فاصلہ کو کافی کے چمچہ سے ناپنے چلا گیا

آفتاب کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

اور دنیا محو حیرت تھی کہ آفتاب ابھی تک سوا نیزہ پر کیوں نہیں پہونچا تھا۔

- - - - -

فرشتہ

انسان نمبر ایک نے اپنے اندر کی آنکھیں نکال کر اپنی باہری آنکھوں پر لگائیں۔ اور اس نے دیکھا کہ ایک مچھلی دوسری مچھلی کو کھا گئی، ایک بڑی سی چڑیا نے چھوٹی سی چڑیا کو دبوچ لیا، شیر نے ہرن کو مار کھایا، اور پلٹ کر جب اس نے اپنی باہری آنکھوں سے دیکھا تو اسے اپنی پشت پر ایک بڑا سا چاقو پیوست محسوس ہوا۔ اس کی پشت سے بہت سا خون بہہ رہا تھا، اور اس کی پشت کے قریب ہی کھڑا انسان نمبر ۲ اپنی خون سے بھری زبان اپنے خون سے بھرے لبوں پر پھیر رہا تھا۔

اور پھر یوں ہوا کہ ایک انسان نے دوسرے انسان کو کھا لیا۔

درندے"

ابلیس کے قہقہہ کی عجیب و غریب آواز فضا میں گونج گئی۔

"بھئی فرشتو! یہ درندے نہیں انسان تھے۔ تمہارے خدائے بزرگ و برتر کی بنائی ہوئی مخلوقات میں سب سے اعلیٰ اور اشرف جن کی باہری آنکھیں انہیں دنیا کے تماشے دکھاتی ہیں اور جن کو باطنی آنکھیں اس لئے ودیعت کی گئی ہیں کہ وہ انسانیت اور حیوانیت میں فرق کر سکیں۔"

ساتویں عرش پر فرشتوں کے ایک غول نے عرش کے ٹوٹے ہوئے
اس ستارے کو جس کا نام ابلیس ہے اور جس کا کام خدا سے جنگ اس روز
گھیر لیا تھا۔ آخر ابلیس بھی تو فرشتہ تھا!

فرشتوں نے پوچھا تھا۔

"خدا سے لڑائی کب تک کرتے رہو گے۔ عرش معلیٰ تک جا پہونچنے
کی کوشش میں کب تک پہیوں میں بھٹکتے رہو گے۔ آخر اس سرپھری کوشش
کا انجام کیا ہوگا؟"

"میری کوششوں کا انجام میری کامیابی ہے اور تمہارے خدا کی شکست۔"

"معاذ اللہ...... تم واقعی شیطان ہو۔ تمہیں خدا کی بارگاہ سے
جو سزا ملی ہے صحیح طور پر تم اس کے مستحق تھے۔"

فرشتوں نے اپنی آنکھیں بند کر کے اپنے لبوں کو ہلا ہلا کر اپنے
خداوند قدوس کی حمد و ثنا کی اور اس سے اس بات کی معافی چاہی کہ
انہوں نے ابلیس کو چھڑ کر اس ذات باری کی شان میں کلمہ وہ کلمات سنے۔

تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ صرف تسبیح گذار فرشتوں
کی تسبیحوں کی کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دیتی رہی۔

ابلیس نے مسکرا کر فرشتوں کو ٹوکا۔

"تم لوگ تو ازل سے اس بیکار سے کام میں جٹے ہوئے ہو۔ کبھی آنکھیں
کھول کر اپنے اس خدا کی شکست کے نمونے تو دیکھو جس کی تعریفیں کر کر
کے اور گن گا گا کر تم نے اپنے وجود کو بے مصرف بنا ڈالا ہے۔"

فرشتوں نے اپنی آنکھیں پھر سے میچ لیں۔ اور ان کے لبوں کی حرکت

بیں تیزی آ گئی۔

"عجیب بات ہے۔ اس طرح آنکھیں بند کر کے ہی تو تم لوگوں نے ابلیس کی اہمیت سے جھوٹ موٹ انحراف کیا ہے۔ آؤ۔ اٹھو۔ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔ خدا نے جو انسانوں کی ایک بستی بسائی تھی۔ اس پر کس کا راج ہے۔"

فرشتوں نے آنکھیں کھول دیں۔ غصہ سے ان کے چہرے تمتما اٹھے۔

"تم پر خدا کی پھٹکار ہو۔ ابلیس! ایسی باتیں کر کے تم کم از کم ہمارا ایمان متزلزل نہیں کر سکتے۔ ہم جانتے ہیں انسان اور انسانیت معراج پر ہیں۔ انسان کی اس بستی میں جس کا تم ذکر کر رہے ہو، اور اسی آدم کی اولاد میں جسے تم نے بھٹکانے کی کوشش کی ہے، رام کرشن، عیسیٰؑ، ابراہیمؑ اور محمدؐ جیسی بھی پیدا ہوئے ہیں جن کا مقابلہ ہم فرشتے بھی نہیں کر سکتے۔"

اس بار ابلیس کی آنکھیں غصہ سے شعلہ بار ہو گئیں۔ "یہی تو ذہنیت کا فرق ہے۔ مٹی کے پتلوں سے تم خود کو کمتر سمجھتے ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ تم ازل سے خدا کی قید میں گھٹ رہے ہو۔ اور میں ایک انکار سے آج آزاد ہوں، خدا کا حریف ہوں، جن لوگوں کا ذکر تم نے کیا ہے، انہیں میں جانتا ہوں۔ خدا کی فوج کے کچھ سپاہی تھے وہ لوگ جنہیں خدا کی مرتی ہوئی انسانیت میری ٹھوکروں سے چوٹ کھا کھا کر دم توڑتی ہوئی انسانیت کو بچانے کے لئے وقتاً فوقتاً بھیج رہا تھا۔"

پھر ابلیس کچھ دم لے کر بولا ___

"لیکن تمہیں قسم ہے تمہارے خدا کی۔ بتاؤ! کیا خدا کے وہ بھیجے سپاہی مجھ پر اور میری کوششوں پر فتح پا سکے۔ انسانیت کو بچا سکے وہ لوگ؟"

"ہاں ہاں! جانتے ہیں ہم۔ خدا کی کچھ مخلوق ایسی ہے جنہیں تم نے اپنے دام میں گرفتار کر رکھا ہے۔ لیکن اس کے لئے انہیں جہنم کی آگ بلا رہی ہے۔"

ابلیس زور سے ہنسا۔

جنت و جہنم کے دھوکے بڑی بڑی دھمکیاں۔ اور خوش آئند وعدے بھی کچھ اثر انداز نہیں ہو سکے۔ خدا کے تمام حربے ناکام ہو چکے ہیں۔ آؤ! میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں دنیا لئے چلتا ہوں اگر تم وہاں ایک انسان بھی تلاش کر سکے تو میں اپنی ہار مان لوں گا۔"

پھر فرشتے تیار ہو گئے تھے۔

"یہ کون سا مقام ہے، جہاں ہمارے پر جھلسے جاتے ہیں؟"

فرشتوں نے اپنے سفید براق پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے ابلیس سے پوچھا۔

"یہ جہنم ہے" ابلیس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"غلط بالکل غلط"

ابلیس پھر ہنسا۔ اس کی ہنسی میں طنز کا زہر گھلا ہوا تھا۔

"معصوم فرشتو! یہ آدمی کا بنایا ہوا جہنم ہے۔ یہ ہیروشیما ہے کتنے سال گذر گئے جب یہاں آگ پھونکی گئی تھی، اور تم اب تک اس کی گرمی محسوس کر رہے ہو۔"

اور ابلیس نے فرشتوں کو آدمی کی بنائی ہوئی بہت سی دوزخیں دکھلائیں ایسے ایسے انسانیت سوز منظر دکھلائے کہ فرشتوں کے ہاتھوں سے

تسبیحیں چھوٹے چھوٹے بچیں۔

فرشتوں کی زبانیں بند تھیں۔ اور ان کی آنکھیں آسمان کی طرف ٹنگی تھیں۔ لیکن اپنی توقع کے خلاف انہوں نے دیکھا کہ آسمان سے بے شمار صلیبیں خون میں نہائی ہوئی نیچے اتر رہی تھیں۔ اور نیچے ساری زمین خون آلود ہو رہی تھی۔

فرشتے بالکل خاموش اور چپ چاپ بہت آگے بڑھ گئے۔

"ہم بہت تھک گئے ہیں"۔

ضرور تھک گئے ہو گے" ابلیس نے کہا: رک کر کچھ دیر آرام کر لو۔"

یہ کون سی جگہ ہے؟" فرشتوں نے اپنی آنکھیں ادھر ادھر گھما کے پوچھا۔

"یہ گوتم اور گاندھی کا ملک ہے"۔

اور فرشتوں نے دیکھا کہ ایک آدمی اپنے سر پر ایک بڑا سا برگد کا درخت اٹھائے کھڑا ہے۔ اور اس برگد میں بے شمار زخموں کے پھول مسکرا رہے تھے۔ اور اس کی ہر ہر شاخ اور پتے پتے سے خون بہہ بہہ کر اس آدمی کو نہائے جا رہا ہے۔

اس سے قبل کہ فرشتے اس انوکھی بات کا مطلب سمجھتے، ان کا دھیان قریب ہی سے آتی ہوئی شور و غل کی آواز کی طرف چلا گیا۔

"وہ کیا ہے؟" بیک زبان گھبرائے ہوئے فرشتوں نے پوچھا۔

ابلیس کی ہنسی بے حد تکلیف دہ تھی۔

وہ........ وہ رانچی میڈیکل کالج کی عمارت ہے اور وہاں ڈاکٹر

اور ہونے والے ڈاکٹر انسانیت کی خدمت کے لئے حلف لیتے ہیں کس خوبصورتی

سے اپنی قسم پوری کر رہے ہیں:

"نہیں نہیں......"

اور جب انسان نمبر ایک نے انسان نمبر دو کو کھا لیا، اور فرشتوں

نے درندگی کے تماشے دیکھ لئے تو ان نیک دل اور معصوم فرشتوں کے دل

غم سے بھاری ہو گئے۔

"خدایا....." اس کے آگے ان کی زبانوں سے اور کیا نکل سکتا تھا۔

پھر فرشتوں نے ابلیس کی نظر بچا کر کھسک جانے میں ہی اپنی اور اپنے

ایمان کی خیریت سمجھی۔ اور وہ سب چپ چاپ وہاں سے کھسک گئے۔

وہ کچھ ہی دور آگے گئے تھے کہ انہوں نے ایک مکان کے پچھلے

دروازے پر دو آدمیوں کو بہت سی دھیمے لہجے میں باتیں کرتے سنا۔

اور ان کے قدم وہیں رک گئے۔

"جلدی چل نکلئے جج صاحب۔ بلوائی اب اسی محلہ پر حملہ کرنے

والے ہیں"

"لیکن تم..... میں کیسے اعتماد کر دوں کہ تم.....؟"

میں آپ کا شک رفع کیسے کر سکتا ہوں یہ حقیقت ہے کہ میں آپکا

ہم قوم اور ہم مذہب نہیں۔ پھر بھی آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں تو کیجئے؟

جج صاحب نے کہا "چلو! دوسری کوئی صورت بھی تو نہیں۔ جان

تو بہر حال جائے گی ہی"

"ٹھیک ہے۔ آپ سب لوگ میرے ٹرک میں چل کر بیٹھئے۔ میں جبتک

اس محلہ کے بقیہ لوگوں کو بھی جمع کر لوں۔"

اور جیسے ہی ٹرک ڈرائیور جج صاحب کے علاوہ عبدل، رحمو، فضلو وغیرہ کو اپنے ٹرک میں بٹھا کر غائب ہوا محلہ کے خالی گھروں میں بلوائیوں نے آگ لگا دی۔

فرشتوں کے چہرے خوشی سے دمک اُٹھے۔

"ہرگز نہیں۔ تم لوگوں کا خیال غلط ہے۔" ایک شکست خوردہ آواز فرشتوں کے کانوں سے ٹکرائی: "وہ فرشتہ تھا۔ انسان نہیں۔"

* * *

دھوئیں کا تخت

دسمبر کی نرم دھوپ کا سونا سارے ماحول میں گھل کر پھیلا ہوا تھا۔ ہوا کسی خود نما اور مغرور حسینہ کی طرح اٹھلا اٹھلا کر چل رہی تھی اور اس کے چہرے پر خوشی کی سرخی گلال بن کر چل رہی تھی۔

"ایک سو پچیس"

"کتنا؟" اس نے چیخ کر پوچھا

ایک سو پچیس من سرکار" لال دھاری نے ترازو میں سے دھان الٹتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھیں حیرت اور مسرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"صرف ایک ایکڑ زمین میں ایک سو پچیس من"

اور وہ اپنے بیلوں کی جوڑی کو تھپتھپاتا ہوا ٹریکٹر پر بیٹھ گیا۔

اس نے پتلون کی جیب سے سگریٹ نکال کر منہ میں لگایا اور لال دھاری کو اسی کی زبان میں ضروری ہدایت دے کر ٹریکٹر اسٹارٹ کر دیا۔

راستہ بھر وہ حساب لگاتا رہا۔ اگر سرکاری نرخ پر بھی دھان فروخت کیا جائے تو سال بھر کا خرچ رکھ کر اس کے پاس...... اور اس کے آگے وہ حساب بھول گیا۔

حساب میں تو وہ شروع سے ہی کمزور تھا۔ ورنہ اس نے انگریزی میں ایم اے کیوں کیا ہوتا

گھر پہونچ کر اس نے ٹریکٹر باہر میدان میں چھوڑ دیا اور اپنے کپڑوں سے گرد جھاڑتا ہوا برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وہاں اس کے والد اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔ اسے سخت کوفت ہوئی کسی نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ کسی کو اس کی آنکھوں میں فتح و مسرت کی جوت نظر نہیں آئی۔ کوئی تو اس سے کچھ پوچھتا لیکن اندر جاتے جاتے راہداری میں اس نے حقہ کی گڑگڑاہٹ کے ساز پر اپنے والد کی آواز سنی۔

"صاحبزادے پڑھ لکھ کر اپنا وقت برباد کر رہے ہیں"

لیکن اس کا دل اپنے کارنامے پر کچھ اس طرح مگن تھا کہ اس نے اپنے والد کی اس بات کا کچھ اثر نہیں لیا۔ اس نے سوچا جب وہ ان کو فصل کی کامیابی کا حال سنائے گا تو وہ اسے خوش ہو کر گلے سے لگالیں گے۔

کمرے میں پہونچ کر اس نے سب سے پہلے ایزل پر لگے کینوس پر نامکمل تصویر کو دیکھا۔ ابھی اس میں بہت کام باقی تھا لیکن اس کے دل میں جو رنگوں کی رِم جھم ہو رہی تھی اس میں ڈوب کر اسے ہوش ہی کب رہا تھا کہ وہ تصویر کو مکمل کرنے کی بات بھی سوچتا

"مادام! پھر کبھی۔ ابھی . . . . ابھی تو میں سوچ رہا ہوں کہ دھان کی ان بالیوں میں کتنا حسن ہے۔ کتنی خوبصورتی!"

اور پھر وہ اپنے بستر پر بکھرے ہوئے رسالوں اور کتابوں کو سمیٹ کر ریک میں رکھنے لگا۔ شانو تم جو یہاں نہیں رہتی ہو تو میرا وجود ہی بکھر

جاتا ہے۔ دیکھو نا کمرے کا کیا حال ہے" پھر وہ آپ ہی آپ مسکرا دیا۔
شانو تو کئی ہفتہ قبل اپنی چھوٹی بہن کی شادی کے سلسلے میں اپنے میکے
گئی ہوئی تھی۔ اب خود اُسے سلیقہ سے رہنا نہیں آتا تو کس طرح شانوں
کی انگلیاں پکڑ کر چلتا رہے گا۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ شانو کا ہاتھ جب سے
اس کے ہاتھ میں آیا تھا۔ اس کی راہ میں چراغ جل گئے تھے اور اس کی منزل
سہل ہو گئی تھی۔ شانو اس کی زندگی تھی۔ اس کا سہارا اور وہ شانو کی
یاد میں نہ جانے کتنے ہی شاعروں کی غزلوں کے خوبصورت اشعار سوچ گیا۔

غسل خانہ جاتے ہوئے اس کی اپنے چھوٹے بھائی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

"کہو میاں انٹرویو دے آئے"

"جی ہاں! لیکن میرے جیسے ایک ہزار گریجویٹ اور پانچ سو ایم اے
پاس امیدوار انٹرویو کے لئے آئے تھے۔"

اسی لئے تو کہتا ہوں ...... لیکن وہ بات پوری کئے بغیر غسل خانے
کے اندر چلا گیا۔ اسے کیا حق پہونچتا تھا کسی کو نصیحت کرنے کا۔ پھر اسے اپنے
والد کا خیال معلوم تھا کہ پڑھ لکھ کر قلم چلایا جاتا ہے، ہل نہیں۔

نہا دھو کر اس نے تنگ مہری کی پتلون والا نیا سوٹ پہنا اور ٹائی
کو گلے میں لپیٹے ہوئے وہ اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ اس گھر میں ایک ماں
جی تو تھیں جو اس کے خیال سے متفق تھیں

"اماں ہم نے اس سال جو بالکل اپنے طریقے سے تین ایکڑ زمین میں
دھان بویا تھا۔ معلوم ہے کتنا دھان ہوا اس میں؟"

"مجھے کیا معلوم" اس کی ماں نے ترکاری کاٹتے ہوئے کہا۔

"اماں سنوگی تو خوشی سے پاگل ہو جاؤگی۔ اس بیں تقریباً چار سو من دھان ہوا ہے۔ باقی کھیتوں کے دھان جو پرانے طریقے سے کئے گئے تھے۔ وہ الگ۔

"ہٹ! جھوٹا کہیں کا۔"

پچھلے سال جو میں نے گنے کے بارے میں بتایا تھا تو تم نے اس بار بھی مجھے جھوٹا ہی کہا تھا۔ تم دیکھنا ماں! میں ان کھیتوں میں سونا اور چاندی اپجاؤنگا۔

پڑھ لکھ کر وہ قلم نہ چلا کر ہل چلانے لگا تھا۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد اس نے مقابلہ کا امتحان دینے کی تیاری شروع کردی تھی۔ لیکن وہ سوچتا کیا ضروری ہے کہ وہ بھی ملازمت ہی کرے۔ خصوصاً جبکہ اس کے پاس خود کاشت زمین تھی۔ اس سے زیادہ افسوس اس وقت ہوتا جب گھر آکر اسے معلوم ہوتا کہ ہر سال کی طرح پھر اس سال بھی اس کے والد نے تھوڑی زمین رہن رکھ دی ہے۔ گھر کی حالت دن بدن متزلزل ہوتی جارہی تھی۔ والد جیسا کہ انہوں نے زندگی بھر کیا۔ گھر بیٹھ کر شطرنج کھیلتے اور کھیتی ایک ملازم کے ذریعہ ہوتی۔ رفتہ رفتہ حالت ایسی ہوتی جارہی تھی کہ کھیتی سے سال بھر کا غلہ بھی نہیں مل سکتا تھا۔ وہ سوچتا کہ وہ گزیٹیڈ آفیسر ہو بھی گیا تو کیا اس کی تنخواہ اتنی ہوگی کہ وہ سابقہ معیار زندگی کے ساتھ پورے کنبہ کی گاڑی کو بھی کھینچتا چلے۔

یہ اتفاق تھا کہ اسے شروع سے باغبانی اور کھیتی باڑی کا بے حد شوق تھا۔ اپنے گھر کے ارد گرد خالی زمین میں وہ طرح طرح کے پھول لگاتا اور سبزیاں اگاتا۔ پھر وہ ان پر نئے نئے تجربے بھی کرتا۔ اسکے دو ہی مشاغل تو تھے۔ کچھ دیر رنگ اور برش لئے تصویریں بناتا اور کچھ دیر وہ اپنے

لگائے ہوئے پھلوں اور سبزیوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ پھر نہ جانے اسکے دماغ میں کیا آیا کہ وہ خود سے کاشتکاری میں پل پڑا۔ پہلے ہی سال، اس کی لگن محنت اور شوق کے نتیجے میں اتنی فصل ہو گئی کہ سال بھر کے خرچ کا غلہ بھی نکل گیا اور باقی غلہ فروخت کر کے اسے ایک قطعہ زمین جو رہن تھی وہ بھی چھڑا لی۔

پھر تو کچھ اس طرح اس کا دل کاشتکاری میں لگا کہ وہ ہر سال مقابلہ کے امتحان کو ٹالتا رہا اور اس کے والد کاشتکاری میں اس کی کامیابی اور اس کے نئے نئے تجربوں کو نظر انداز کر کے اس سے اور خفا ہوتے رہے۔ ان کے خیال میں وہ ان کے خاندان کی عزت کو ملیا میٹ کر رہا ہے۔

"ہل چلا کر سوسائیٹی میں عزت نہیں ہو گی میاں۔ کوئی پاس نہیں بیٹھنے دے گا۔" لیکن وہ تو آہستہ آہستہ اس طرح کی ڈانٹ سننے کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ سوچتا آخر میں کون سا ذلیل اور نیچ کام کر رہا ہوں۔ کسی بھی حساب سے وہ دنیا کے کسی بھی پیشہ یا ملازمت میں اتنا جلو پیسوں کے متعلق مطمئن نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تو واقعی ناقابل یقین کرشمہ تھا کہ محض چند سالوں میں رہن رکھی ہوئی تمام زمینوں کو چھڑوا لیا تھا۔ ٹریکٹر خرید لیا تھا اور سارے گھر کی زندگی بڑے اطمینان اور خوش حالی سے گزرنے لگی تھی اور وہ ہر طرح خوش تھا۔

البتہ وہ اس روز ملول ہو جاتا جب ستانو کے چہرے پر اداسی دیکھتا۔ وہ پوچھتا۔

"شانو! کیا تم بھی مجھ سے خفا ہو؟"

اور شانو جب مسکرا دیتی تو وہ جھوم جھوم کر گنگنانے لگتا اور پھر اس کی مسکراہٹ کو اپنے تخیل میں چرا کر ایک بڑی خوبصورت تصویر کا روپ دے دیتا۔

لیکن ایک روز جب وہ کھیت سے گھر واپس آیا تو اسے شانو کے چہرے پر شدید تناؤ کا احساس ہوا۔ "کیا بات ہے شانو؟"

"کچھ نہیں۔"

"کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔"

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو اپنے منے سے پوچھ لو۔"

"اچھا منے تم ہی بولو۔"

اس کے چھوٹے سے بیٹے نے چہرے پر سنجیدگی کا رنگ لا کر کہا "ابو! وہ راجو ہے نا، اس کے بابو جی ڈاکٹر ہیں، گڈو کے ڈیڈی وکیل۔ رانی کے باپ ڈپٹی صاحب۔ اور وہ ہے نا اس کے ابا وہ...... کیا ہوتا ہے..... شانو نے اس کے غصہ کی بات کہہ دی۔ "ہڈ اسٹنٹ" منے نے پھر گال پھلا کر پوچھا۔ "لیکن ابو آپ کیا ہیں؟ مجھ سے سب پوچھتے ہیں..... اور وہ سچ مچ لاجواب ہو گیا۔

پھر اس نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"بیٹے میں کھیتی کرتا ہوں۔"

"ہٹ کھیتی تو کلو میاں کرتے ہیں۔"

تھوڑی دیر تک کمرے میں خاموشی رہی۔ پھر اس نے شانو کو مخاطب

کر کے کہا۔

"وہ سارے لوگ دھوئیں کے تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک بھرم ہے جس کے پیچھے لوگ تباہ ہیں۔"

اور اس روز تو وہ بے حد خوش تھا۔ اسے اتنی خوشی تو اس سال بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ جب گنے کی کامیاب فصل پر اسے انعام ملا تھا۔ دنیا کا ہر فرد اس کی نظر میں اس روز بڑا ہیچ معلوم ہو رہا تھا۔

بازار میں جانے کے لئے رکشے پر بیٹھے ہوئے اس نے سوچا اگلے سال وہ ایمبیسی کار کے لئے آرڈر بک کر دے گا۔ پھر بڑی شان سے اس نے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ نکال کر لبوں کے درمیان ذرا ترچھا کر کے دبا لیا۔

کپڑے کی دکان میں بیٹھا ہوا وہ شانو کے لئے قیمتی ساڑیاں اور منے کے لئے کپڑے منتخب کر رہا تھا کہ بیچ میں دکان کا مالک اور اس کا سیلز مین اسے چھوڑ کر باہر کی طرف لپکا۔

"آیئے۔ آیئے ڈاکٹر صاحب۔ بہت دنوں بعد درشن ہوئے۔"

پھر ابھی ڈاکٹر صاحب کو ٹھکانے سے بیٹھایا بھی نہیں گیا تھا کہ اس نے دیکھا کہ دکان کا مالک اپنے مصنوعی دانتوں کی بتیسی نکال کر ہنستے ہوئے کسی اور کا استقبال کرنے کے لئے آگے بڑھا۔

"حاکم..... آیئے آیئے۔ ارے! آپ نے کیوں تکلیف کی۔ اردلی کو بھیج دیا ہوتا، میم لیسنو کے لئے کپڑے بھجوا دیتا۔"

پھر ان دونوں کے لئے چائے آئی۔ اور سگرٹ اور پان بھی۔ اور وہ خاموش بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ اس کے اندر کوئی چیز کلبلاتی رہی اُسے

ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بڑی اونچائی سے نیچے گر پڑا ہو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں اور ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ کس چیز کی کمی ہے اس میں۔ آخر وہ بھی تعلیم یافتہ ہے۔ کام کرتا ہے۔ اچھے پیسے حاصل کرتا ہے۔ سلیقے کے کپڑے پہنتا ہے پھر اس کی ایسی بے قدری کیوں۔

تھوڑی دیر انتظار کے بعد اس نے دکاندار کو مخاطب کیا لیکن دکاندار اور اس کے تمام ملازم جیسے اس کی طرف کان بند کئے ہوئے تھے۔ بڑی مشکل سے دکاندار منھ بنا کر بولا۔

دیکھئے بھائی۔ ابھی انتظار کرنا ہوگا۔ میرے پاس فاضل آدمی نہیں ہے۔ اور وہ پیچ و تاب کھاتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا۔

اُسے اس طرح کے واقعات سے کتنی ہی بار قبل بھی دوچار ہونا پڑا تھا۔

اسپتال میں، اسٹیشن پر، سینما گھروں میں ...... گویا ہر قدم پر اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دنیا کی ہر ملازمت اور پیشہ والے کو اس پر فوقیت حاصل ہو۔ جیسے وہ لوگ کسی تخت طاؤس پر بیٹھے ہوئے ہوں۔ اور وہ ــــ

لیکن اس نے ذہن سے اس کربناک خیال کو جھٹک دیا اور پھر ایک بشاشت مسکراہٹ اس کے لبوں پر دوڑ گئی اور وہ ایک رسالہ اٹھا کر گیہوں کی فصل کے متعلق کچھ غیر ملکی سائنٹیفک تجربات کے ایک مضمون کو پڑھنے لگا۔

شانو کے پاس پہونچ کر اس نے سب سے پہلے شانو کو دھان

کی کامیابی کا حال سنایا بشانو واقعی بے حد خوش ہوئی، اور وہ اسکے مسکراہٹ سے گلنار چہرے کو اپنی ہتھیلیوں میں لیئے دیر تک اپنی آنکھوں سے چومتا رہا پھر شانو ہنستی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"باہر بھی جائیے۔ لوگ کیا کہیں گے ؟"

اور جب وہ تیار ہوکر باہر آگیا تو اس نے دیکھا گھر کے تمام افراد کسی خصوصی مہمان کے پرتپاک استقبال میں منہمک تھے۔ وہ بھی پھاٹک تک چلا گیا پھر لوگ نہیں لیئے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے۔ خصوصی مہمان شہر کے بڑے بڑے افسر تھے اور اس کے خسر کے گہرے دوست

تعارف شروع ہوا۔

"یہ میرا لڑکا ہے۔ مقامی کالج میں پروفیسر ہے"

"بہت خوب"

"اور یہ میرے بڑے داماد ہیں۔ ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے ہیں"

"اور یہ میرے دوسرے داماد ہیں"

اس کی طرف اشارہ کر کے اس کے خسر خاموش ہو گئے۔

مہمان خصوصی نے طنگار کا گوشہ تدڑتے ہوئے پوچھا

"بھئی یہ کیا کرتے ہیں ؟"

ایسا لگا جیسے اس کے منہ پر تالا لگ گیا ہو اور اس کے خسر یوں جلد جلد پان کی پیک اگالدان میں پھینکنے لگے جیسے انہیں کوئی جواب نہیں مل رہا ہو۔ بالآخر وہ رک رک کر بولے۔

"ان کے والد سے تو آپ واقف ہوں گے۔ کافی بڑے زمیندار تھے۔

بڑا پرانا شریف گھرانا ہے ان کا۔"

اسے بڑی حیرت ہوئی جیسے اس کا اپنا کوئی STATUS نہیں تھا۔ ورنہ اس کے والد کے حوالے سے کیوں متعارف کر دیا جاتا۔

سگار کا سیاہ دھواں اگلتے ہوئے مہمان خصوصی اس کی طرف پھر رجوع ہوئے۔

"میاں! تم کچھ کرتے ہو یا ابھی بے کار ہو؟"

"میں کھیتی کرتا ہوں...... اور اس سال..."

لیکن انہوں نے اس کی بات کاٹ دی

"تم نے کہاں تک پڑھا ہے؟"

"جی میں ایم اے کر چکا ہوں۔"

"افوہ! تب تو تم اپنے TALENT کو مٹی میں ملا رہے ہو۔ کچھ تو کرو۔ کچھ بھی نہ ہو تو اسکول میں ٹیچری، کسی پرائیویٹ فرم میں ملازمت، کوئی باعزت پیشہ....."

اور اس سے قبل کہ اس کے پندار کا صنم کدہ پورے طور پر مسمار ہو جائے وہ کوئے ملامت سے اٹھ آیا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دل پر بوجھ۔ وہ عجیب دوراہے پر آ گیا تھا۔ کدھر جائے کیا کرے۔ لیکن ذہن نے فیصلہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اور وہ آنکھیں بند کر کے صبح کے انتظار میں بستر پر لیٹ گیا۔

•••

...رو یا کئے بہار کو ہم

رات آہستہ آہستہ زینہ بہ زینہ خاموشی سے اتر رہی ہے۔ اس کی سیاہی ساری فضا اور سارے ماحول پر دبیز ہوتی جا رہی ہے۔ یہ وہ رات نہیں جو کبھی چاندنی کا تاروں بھرا دوپٹہ اوڑھے چھن چھن کرتی پُروائی کا پازیب باندھ کر نغمے بکھیرتی آیا کرتی تھی۔

سردی اتنی شدید ہے کہ خون شریانوں میں منجمد ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ کمرے میں آتش دان میں جلتی ہوئی لکڑی کی آگ بھی سرد ہوئی جا رہی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کمرے کے باہر مہیب سناٹا اور گہری تاریکی کا راج ہے۔

سامنے میز پر رکھے ہوئے نامکمل سویٹر میں لگی ہوئی لوہے کی تیلیاں نیلو کو اپنے سینے کے اندر بہت اندر پیوست ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں۔

"تم آئی۔ اے۔ ایس ہو جاؤ گے ارشد تو ...؟"

"تو میں بہت خوبصورت سی کنٹیسا کار خرید لوں گا اور اس کار کا رنگ ——— ہاں بھئی رنگ اُس کا تمہاری پسند کا ہو گا۔"

"میری پسند؟ میری پسند تو ...؟"

"تمہاری پسند ——— ہاں! تمہاری پسند کا ——— سرخ رنگ تمہیں پسند ہے نا نیلو؟"

"سرخ رنگ ـــــ جو خوبی تمنّا کا رنگ ہے۔ جو اس آتش دان میں جلتی ہوئی اس آگ کا رنگ ہے۔

دوسرے کمرے سے منّا اور چنّی کے لڑنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ باورچی خانے سے بھُنے جانے والے کباب کی بُو آرہی ہے۔

نیلو پھر سویٹر بننے لگی ہے۔

رات کی سسکیاں صاف سُنی جا رہی ہیں اور فضا میں میر کی شاعری مریخ بس گئی ہے۔

"نیلو! یہ کیا ہے؟"

"سیب"

"کیسا ـــــ کس رنگ کا؟"

"ایکدم سُرخ ـــــ جیسا کہ۔۔۔"

"بڑے وہ ہو تم!"

آتش دان میں جلتی ہوئی آگ کے شعلے کے عکس نے اُس کے چہرے کی سُرخی کو اور سُرخ کر دیا ہے۔ ایکدم سُرخ۔ جیسا کہ سیب!

بغل والے کمرے میں چنّی زور زور سے انگریزی کی ایک نظم یاد کر رہی ہے۔

وہ رات غم کے سیاہ آنچل میں اپنا چہرہ چھپائے اُسی طرح باہر کھڑی ہے۔

"اندھیرے سے تم بہت ڈرتی ہو نیلو؟"

"ہاں مجھے ڈر لگتا ہے ـــــ اندھیرا میرا مقدر نہ بن جائے!"

"پگلی! تم روشنی میں پرورہ۔ تمہاری زندگی میں اندھیرے کا گزر کیا معنی؟"

"امی نے تو ڈر تی ہوں ارشد! ——— سُنا ہے، زندگی اندھیرے اور روشنی دونوں ہی کا نام ہے۔ نہ جانے روشنی کی یہ بہار کب ختم ہو جائے۔"

ماموں جان کی اتنی بڑی جائداد ہے۔ اتنی ساری دکانیں ہیں اور نہ جانے کیا کیا کچھ ہے۔ یہ خوبصورت لان، یہ پھول، یہ فردوس اور یہ چھوٹا سا تمہارا اسمان!

نہیں ارشد! یہ سب کچھ نہیں۔ صرف میری تمنائیں میری اپنی ہیں۔ میری آرزوئیں میری ہیں۔"

دوسرے کمرے میں ریڈیو پر بی۔ بی۔ سی سے اردو میں خبریں نشر ہو رہی ہیں۔

"لندن میں بہت سخت برفباری ہوئی ہے۔ اتنی سردی پڑی کہ بگ بن، بھی بند ہو گیا ہے۔۔۔"

کاش یہ حد سے بڑھی ہوئی سردی دل کا دھڑکنا بھی بند کر دے۔ نیلو نے آتشدان میں جلتی ہوئی آگ کو کریدا ہے۔ راکھ ہٹ گئی ہے۔ چمکتی ہوئی چنگاریاں جگنو بن کر اڑنے لگی ہیں۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین! نیلوفر ناہید صاحبہ اپنی سالگرہ کی خوشی میں ایک غزل سنائیں گی۔"

"کم آن بے بی۔" (COME ON BABY)

"نو ——— ابو ——— آئی کانٹ" (NO ABBU, I CANT)

"تو ——— وہ لو ——— تم اس طرح مجھے کھا جانے والی نظروں سے کیوں دیکھ رہی ہو۔ میں نے کب کہا کہ تم اپنی غزل سناؤ۔ کسی کی غزل بھی تمہارے منہ سے بھلی معلوم ہو گی۔"

"ارشد صاحب! آپ بے حد خوبصورتے جا رہے ہیں!"

پھر پیانو کے دل پر چوٹ لگی ؎

"جانے لالہ و گل میں جھلک رہی تھی خزاں
بھری بہار میں رویا کئے بہار کو ہم"

تالیاں!

منّا اور چُھنّی جس کمرے میں ہیں وہاں سے منّا کی تالیوں کی آواز آرہی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چھنی ہار گئی ہے۔

چھنی ہار گئی۔ ہارتی آئی ہے۔ ہارتی رہے گی۔

چھنی روتی ہوئی اس کے پاس آگئی ہے

اِن آنسوؤں کی جگہ تمہارا دامن ہے چھنی! یہ موتی کسی قیمت کے نہیں۔ ویسے یہ موتی بہت قیمتی بھی ہیں۔ ساری زندگی کے عوض یہی دولت تو ملتی ہے۔ ہمیں تمہیں اور ہم جیسے بہتوں کو چُھنّی!

راستے کب کے کھو گئے۔ منزلیں نہ جانے کب کھو گئیں۔ سوچ کا گلستاں بھی لٹ گیا۔

لیکن زندگی ہے کہ بے مقصد چلتی جا رہی ہے۔ نہ معلوم کب رکیں گے اس کے قدم۔

بابل کا گیت تو بیراتنیں رہما گاتی ہیں اور ہر لڑکی اپنے میکے سے رخصت ہوتے وقت شاید رہما ہی لیکن روتی ضرور ہے۔

لیکن اس کی اپنی آنکھوں کا امڈا ہوا سمندر کہاں چھلکا تھا۔ دل پر دکھ بھری کالی گھٹاؤں کا بوجھ تھا۔ لیکن بارش کہاں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دل نے

اور آنکھوں نے ساز باز کرلی ہو۔

آنکھوں کی جھیل نے آنسوؤں کے موتی پی لئے اور دل کے صدف میں غم بند ہو گیا۔

"میم صاحب! صاحب کا فون!"

"اوں... ہاں... کیا ہے... اوہ... اچھا اچھا!"

اور وہ اس طرح چونکی جیسے جنم جنم سے سوتی رہی ہو۔

"ایک سیاسی جماعت کی طرف سے ایجی ٹیشن ہونے والا ہے۔ میرا ابھی یہاں موجود رہنا ضروری ہے۔ میں آج واپس نہ آسکوں گا۔"

"ان ہنگاموں سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ آپ چلے آیئے۔ خدارا!"

"ہش تم گھبراؤ نہیں ———— پھر ڈارلنگ تم ہی سوچو میں کیسے آسکتا ہوں۔ پورے سب ڈویژن کا ذمہ میرے سر ہے..."

اور اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رسیور رکھ دیا۔

اس کے ہونٹ کانپے۔ دل رو دیا۔

یہ کیسی بہار ہے میرے خدا!

پھر اس کے خیالوں میں نہ جانے کیسی بجلی چمکی کہ وہ ساری کی ساری اُس میں جل کر روشن ہو گئی۔

"تم خود سے خود کو کہاں تک چھپاتی رہو گی نیلو!"

لیکن اُس کمرے میں "نیلو" کہاں کوئی ہے۔

دریچے بند کر دو۔

دروازے اب نہ کھلیں گے یہاں۔ ان پر تو "مسز نیلو فر عباس" کا نیم پلیٹ

لگا ہے۔

یہ وہ وادی نہیں "ارشی" جہاں نیلوفر رہتی تھی۔

تم تلاش کرو گے اُسے، ڈھونڈو گے اسے۔ لیکن وہ اب کہاں مل سکتی ہے

سردی کتنی ہے۔ اُف!

اور یہ رات کم بخت باہر کھڑی ٹھٹھر رہی ہے۔ کہیں یہ رات مر گئی تو رات کے مرنے کا ماتم کون کرے گا۔

"تم یوں کیوں سوچتی ہو نیلو؟"

"ارشی! میں اپنی اتنی سوچ کو کیا کروں۔ لیکن تم... تم کیا سوچتے ہو؟"

"میں یہ سوچتا ہوں مس نیلوفر ناسیلہ صاحبہ! کہ آئی۔ اے۔ ایس کے امتحان کو اب کچھ ماہ رہ گئے ہیں، اور اس کے بعد..."

"آئی۔ اے۔ ایس کی دُم کے بغیر تم مکمل نہ ہو گے کیا؟"

"اس دُم کے بغیر بھی میں مکمل ہوں نیلوفر! لیکن تمہارے ابو کا خیال ہے کہ اور بہت سی چیزوں کی طرح آئی۔ اے۔ ایس داماد بھی STATUS SYMBOL ہے ——— اور پھر ہو سکتا ہے یہ صحیح ہو کہ زندگی کی بہاریں STATUS کے بغیر..."

"لیکن یہ ابو کا خیال ہے!"

"جی ہاں! سردست داماد کی ضرورت آپ کے ابو ہی کو ہے!"

"منہ دھو ڈالیے مسٹر ارشد... ہونے والے آئی۔ اے۔ ایس صاحب!"

جنت میں حوروں کی ہنسی کی جلترنگ شاید فرشتوں نے بھی نہ سنی ہو۔ لیکن ارشد کے کانوں میں اس وقت کچھ ایسے ہی نغمے سے بج اُٹھے تھے۔

"خوب ہنسیے۔ خوب ہنسیے محترمہ! لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ سب ہو گا اور ایک دن..."

کمرے کے باہر خوفناک ہواؤں کی آسیبی ہنسی۔ بس گھری ہوئی رات خوف سے کپکپا رہی ہے۔

سوئیٹر بننے کی تیلیوں کی نوک بہت باریک تو نہ تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیسے اُس نے اپنی انگلیوں میں اُن کی سمت چبھن محسوس کی۔

"تم روتے ہو ارشی! رونے سے تمہارے ابا واپس آجائیں گے کیا؟"

"میں رو تا کہاں ہوں نیلو۔ یہ آنسو نہیں ہیں۔ یہ پانی ہے۔ شاید اس میں بہہ کر میرے ٹوٹے ہوئے بلّوریں خوابوں کے ریزے باہر نکل جائیں۔"

باورچی خانہ سے عقب کی بیڑی کا تلخ دھواں کمرے میں بے دھڑک گھسا آرہا ہے اور باہر آسمان رونے لگا۔

"ارشی!"

"ہوں۔"

"میں نے سنا ہے تم نے مقامی فرم میں ملازمت کر لی ہے۔"

"ٹھیک ہی سنا ہے تم نے۔ ابا آرام کرنے کے لئے جنت سدھارے گاڑی کو نئے انجن کی ضرورت تھی۔ —— ؟"

"اور وہ امتحان —— ؟"

"زندگی خود ایک بہت بڑا امتحان ہے نیلو!"

کمرے میں سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ سکون۔ بہت گہرا سکون ہے۔ ہر طرف نیلو کی سانس کی آواز کمرے کے سکوت میں تیر رہی ہے۔ ہاں! صرف سانس ہی تو چل رہی ہے۔ مُنّا اور چُنّی غالباً سو گئے ہیں۔ مگر ان کے خوبصورت کھلونوں نے بھی آنکھیں مُوند لی ہیں۔

عبدل رام بھروسے پر اپنی علمیت اور واقفیت کی دھونس جماتے ہوئے کہہ رہا ہے۔

"سینس کا کمال ہے رام بھروسے! آدمی چاند پر چلا گیا ہے!"

ایس۔ ڈی۔ او صاحب کے آرڈرلی رام بھروسے کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے۔

"سنا تو ہم نے بھی ہے عبدل! پر چندرما اور دھرتی کے بیچ کی دوری کتنی ہے بھلا...؟"

ہاں! چاند اور زمین کے بیچ کا فاصلہ ممکن ہے۔ لیکن لب اور پیالی کے درمیان کی دوری ـــــ الاماں!

"ارتھی! تم بھی تو نہ ناپ سکے اس دوری کو!!"

* * *

نیا سُقراط

اللہ رسے ٹوٹا پھوٹا ادھر ادیب ہے صحیح و سلم وہ اپنے چھوٹے سے شہر کے واحد بڑے سے ریستوراں کے ایک صاف ستھرے کیبن میں بیٹھا ہوا تھا۔

"ایک پیالہ زہر"

ہوٹل کے بیرے نے اپنی دونوں آنکھیں پھاڑ کر اس کو دیکھا ——

تم میری طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو۔ میں کوئی سقراط نہیں۔ میں.... میں..... مجھے زہر چاہیئے۔ ایک دم جلدی۔ میرے پاس وقت نہیں۔ میری بیوی سخت بیمار ہے میں اس کے لئے دوا لانے نکلا ہوں۔"

بیرا اور گھبرا گیا۔ اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی پھر اس نے بھاگ کر تمام دوسرے بیروں کو اس عجیب و غریب آدمی کے متعلق خبر کر دی۔

کیبن میں بیٹھے بیٹھے جب وہ اکتا گیا تو اس نے لکڑی کی دیوار پر لگے کالنگ بل کے بٹن کو زور زور سے دبانا شروع کر دیا۔ گھنٹی بے تحاشہ بج اٹھی۔ منیجر کو خود کاؤنٹر چھوڑ کر دوڑنا پڑا۔

"کیا چاہیئے آپ کو؟"

"میں کب سے ایک پیالہ زہر مانگ رہا ہوں۔ لیکن آپ کے یہاں کے بیرے اس قدر نامعقول ہیں کہ...."

منیجر بات کاٹ کر بولا "حضور! معقول سی بات کیجیے یہ ہوٹل ہے یہاں زہر نہیں ملتا۔"

"کم فہمی کا علاج نہیں۔" اس نے جھنجھلا کر نئی جلائی ہوئی سگریٹ کو توڑ موڑ کر ایش ٹرے میں ڈال دیا۔

آپ لوگ کچھ سمجھتے نہیں، زہر تلخ ہوتا ہے۔ کافی بھی تلخ ہوتی ہے۔ انسان جب اپنے غموں سے گھبرا کر خودکشی کرنا چاہتا ہے تو زہر پی لیتا ہے۔ لیکن آج کا انسان جس کو ہر لمحہ مرنا پڑتا ہے۔ پھر مر مر کر جینا پڑتا ہے۔ اس کے غموں کا علاج کم از کم وہ سیال سی تلخ شے ..... آپ اسے کافی کہتے ہیں اور میں زہر۔"

"تو ایسے کہیے نا بابا۔" بنگالی منیجر نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی۔

پھر منیجر وہاں سے چلا گیا۔ اور گرم کافی کا ایک پیالہ وہاں آ گیا۔ اس نے اس زہر کا ایک گھونٹ لیا اور محسوس کرنے کی کوشش کی کہ وہ مر گیا ہے۔ زہر کے سرور سے تم اسے غموں سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔

پھر سگریٹ کے ایک لمبے کش کے ساتھ اس کے اندر جان واپس آ گئی۔

"لو غموں نے مجھے پھر پکڑ لیا۔"

زہر کے پیالے نے اس سے پوچھا۔

"تمہارے غم کیا ہیں؟"

"یہی تو میں نہیں جانتا۔ پھر بھی بے شمار غم ہیں جن کی دریافت میں نہیں کر سکا ہوں۔"

اس کی خاموشی نے جواب دیا۔

"تمہیں اپنی محبت کی ناکامی کا غم ہے۔" نہ جانے کس نے آہستہ سے اس کے

کانوں میں سما کر پوچھا۔

"شاید"

پھر اس نے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنے اندر جھانکا۔ نہاں خانۂ دل کردہ اور ناکردہ محبتوں کی کامرانیوں کے پھولوں سے گلزار بنا ہوا تھا۔

"اس نے سوچ کر بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

اس کا غم ہے کہ مجھے وہ غم کیوں نہیں۔"

زہر کا پیالہ لاجواب ہو گیا۔ اب ایش ٹرے کی باری تھی

"تم بیکار ہو کیا؟ فاقوں کی نوبت ہے؟ نوکری نہیں ملتی؟ یہی غم ہے نا تمہیں؟"

اب کے زہر کا گھونٹ اس کے حلق میں اٹکتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر زہر کا گھونٹ پی کر وہ بولا۔

"مجھے فاقوں کی نوبت نہیں ہو سکتی۔ میرے باپ نے اتنا پیسہ چھوڑا ہے کہ مجھے بے روزگاری کا غم نہیں ....."

"پھر کیا ہے۔ کیوں پریشان ہو تم؟"

وہ خاموش رہا سگریٹ کا دھواں اس کے حلق کو تلخ کرتا رہا۔

ایش ٹرے پھر بولا

"کچھ تو بولو۔ کیا غم ہے۔ موجودہ نظام حکومت سے غیر مطمئن ہو تم۔ سماج کا ڈھانچہ پسند نہیں۔ عالمی امن کے مسئلہ نے تمہیں پریشان کر رکھا ہے۔ آخر.."

وہ زچ ہو گیا۔ جلتی ہوئی سگریٹ اس نے غصہ میں ایش ٹرے کے اندر ڈال دیا۔

ان خارجی الجھاؤں میں آج کا با شعور انسان نہیں الجھ سکتا۔ سارے جہاں کا درد میں کیوں مول لے لوں۔ وہ غم جو صرف میرے ہیں ان کا بھی مداوا ممکن نہیں پھر یہ امن۔ جنگ، بھوک، سماج۔ الا بلا۔ ان کے لئے میں کیوں دبلا ہوتا پھروں۔ میں تم سے پوچھتا ہوں"

اس نے رک کر سانس لی اور پھر بولنے لگا۔

"یہ جو تمہارے اندر آگ ہے۔ یہ جو دھواں تمہارے اندر سے اٹھتا رہتا ہے۔ کبھی تم نے سوچا یہ کیا ہے۔ تم اپنے اندرونی کرب سے کبھی واقف ہو سکے ہو؟"

ایش ٹرے سے یہ طویل سا سوال کر کے وہ ایک فلسفیانہ مسکراہٹ کے ساتھ کرسی کی پشت سے ٹیک کر جواب کا انتظار کرنے لگا۔

ایش ٹرے بھی عجیب گستاخ قسم کا تھا۔ اس نے منہ توڑ جواب دیا۔

"یہ دھواں میرے کسی اندرونی کرب کا مظہر نہیں۔ یہ تو نتیجہ ہے اس جور و ظلم کا جو تم جیسے سگریٹ نوش لوگ مجھ پر ڈھاتے رہتے ہیں تم جلتی ہوئی سگریٹ کے ٹکڑے مجھ میں نہ ڈالو۔ پھر یہ دھواں نہیں نکلے گا۔"

ہوں۔ EFFECT اور CAUSE بات اونچی کرتے ہو۔ لیکن بہت ہی قدیم اور بوسیدہ۔" اس نے جلتی ہوئی سگریٹ کا ٹکڑا پھر ایش ٹرے کے اندر ڈال دیا۔

پھر نہ جانے کیسے میز میں حرکت ہوئی اور ایش ٹرے کے قریب رکھے ہوئے گلاس سے تھوڑا پانی چھلک کر ایش ٹرے کی اندر کی آگ کو بجھا گیا۔

لیکن اسے خود اپنے وجود کے اندر سے ابھی تک دھواں اٹھتا محسوس

ہو رہا تھا۔ حالانکہ جیسے وہ زہر سمجھ کر پی رہا تھا نصف سے زیادہ ختم ہو چکی تھی اور سگریٹ کے پیکٹ میں بھی صرف دو سگریٹیں باقی بچ رہی تھیں۔

"اُف کس قدر تنہائی ہے۔ اس بھری پری دنیا میں اکیلا ہوں۔ کون ہے جو سمجھے میرے درد کی زبان"

یہ جملے اس نے نہ جانے کہاں پڑھے تھے۔ اور ان جملوں نے اسے آگہی بخشی تھی۔ جس سے وہ اپنے اندر کے کرب کو اپنی روح کی پیاس کو محسوس کرنے کے لائق ہو سکا تھا۔

عجیب احساس تنہائی تھا۔ عجیب کیفیت تھی محرومی کی جس نے اپنے آپ سے بھی بیگانہ کر دیا تھا۔

اپنے غیر مانوس اور اچھوتے غموں کے حصار میں گھرا ہوا تنہا وہ اس کیبن میں بیٹھا رہا اور کیبن کے باہر دنیا بڑی تیز رفتاری سے دوڑتی رہی اور تیز قدموں کی چاپ اس کے کانوں سے ٹکراتی رہی۔

"چاند کو انسان نے فتح کر لیا ہے۔"

"زندہ باد انسان"

"دل کا آپریشن۔ ہارٹ پلانٹیشن۔۔۔۔؟"

پھر بغل کے کیبن میں چوڑی کھنکی۔

"تم اب آئی ہو۔ میں کب سے تمہاری راہ میں نظروں کا فرش بچھائے بیٹھا ہوں۔

"مجھے ٹیوشن سے ابھی فرصت ہوئی ہے۔"

"تم واقعی بہت۔۔۔۔"

پھر اُس کیبن میں دونوں کے قہقہے گھنگھرو باندھ کر رقص کرنے لگے۔
اور اُس کیبن میں وہ بیٹھا سوچتا رہا۔ یہ کون لوگ ہیں جنہیں اتنی فرصت ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لئے اس قدر بے چین ہو سکیں۔ دنیا کم بخت چلتی ہی جا رہی تھی۔ اس کے بے رحم قدموں کی آواز اس کے ذہن پر چوٹ پہونچاتی رہی۔

"کینسر کا علاج اب تک۔۔۔"

"چاپ لاؤ۔"

"ایک چائے ادھر، جلدی ہے مجھے بہت کام ہے۔"

"ادب۔ میں ایک نیا موڑ آیا ہے"

"بہت نیا، بے حد جدید۔"

اس نے گھبرا کر اپنے دونوں کان بند کر لئے۔ اسے ایسا لگا کہ آوازوں کے سیلاب میں اس کا اپنا غم بہ جائے گا۔ لیکن وہ اپنے بیش بہا غموں کو مضبوطی سے پکڑے رہا اور احساسِ محرومی اور تنہائی کے بیش قیمت لبادہ میں اپنے آپ کو چھپائے ہوئے اپنے کرب اور اپنے غموں کو ٹٹولتا رہا۔

"باہر کس قدر شور ہے۔ ہنگامہ ہے۔ کتنے لوگ ہیں۔ لیکن سب اجنبی۔"
اسنے آخری بار سوچا اور بڑی بے دلی سے کرسی سے اٹھ گیا
کیبن سے جیسے ہی وہ باہر آیا ایک جانی پہچانی آواز اسنے سنائی

"ارے تم۔!"

اسنے اپنے دیدے گھمائے۔ اسے بڑی حیرت ہوئی اجنبی لوگوں کی

اس دنیا میں یہ جانی پہچانی آواز۔۔ پھر اس کے اندر کے "اس" نے اسے سمجھایا۔

"یہ دھوکہ ہے۔ فریب، یہاں کوئی نہیں ہے۔ سب ایک بڑی مشین کے پرزے ہیں۔"

لیکن در حقیقت وہاں احمداد رمہیش اس کے دو پرانے دوست بیٹھے اسے پکار رہے تھے۔

"ارے سنو تو یار! کہاں رہتے ہو آج کل؟"

"میں...... ہاں ...... وہ ...... ذرا ...... ان دنوں سخت پریشان ہوں۔"

"کیا پریشانی ہے؟"

پھر وہی سوال۔ وہ ان کم فہموں کو کیا جواب دیتا اس نے جلدی سے یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

پھر کبھی۔ ابھی بہت کام ہے۔

اس کے دونوں دوست عجیب طور سے مسکرا اٹھے اور ان کے جواب نے اس کا تعاقب ہوٹل کے دروازہ تک کیا۔

"پریشانی یہ ہے کہ تمہیں دنیا میں کوئی کام نہیں۔ کام ہوتا تو پریشانی نہیں ہوتی۔"

اس نے بڑی حقارت سے مڑ کر ان کی طرف دیکھا اور باہر نکل گیا۔

"کام...... کام...... کام...... نہ جانے کس صدی کے ہیں یہ لوگ — پہلے اپنے غموں سے تو فرصت ہو، تب کوئی کام کرے۔

اور وہ بے رحم لمحوں کی آگ۔ میں جلتا ہوا گنجان سڑک کی ویرانی میں آگے بڑھتا رہا۔

اے جناب! ایک نئی کتاب آئی ہے۔"

اس کے قدم یک بیک رک گئے۔ اور اس نے بک اسٹال پر لگی ہوئی بہت سی کتابوں اور رسالوں کو دیکھا۔ ان میں سے نہ جانے کتنی ہی کتابوں کو وہ پڑھ چکا تھا۔

" دیکھو تو۔"

" ارے یہ کتاب! میں تو نہ جانے کب سے اس کی تلاش میں تھا۔"

کتاب اس نے خرید لی۔

شہر کی گنجان آبادی کے سناٹے میں وہ خود کو بالکل تنہا اور اکیلا محسوس کرتا رہا۔ اور سڑکوں پر بے مقصد گھومتا رہا

یہ مندر

وہ مسجد

یہ خوب صورت دکانیں

یہ اسپتال

یہ گرجا اور یہ عظیم الشان سمندر

" سمندر کی لہریں ایک FORCE ہیں۔ زندگی کا سمبول ہے لیکن یہ سمندر خود اپنے دکھ نہیں جانتا۔"

اور یہ گرجا کے باہر جو صلیب کا نشان ہے اس پر اس نے خود کو مصلوب محسوس کیا

لیکن کیوں؟ مسیح کو صرف اپنے غموں کے لئے تو سزا نہیں دی گئی تھی۔

"پھر.....!"

"کراس اور سواستک ایک ہیں۔ دونوں سمبول.....؛

نئی خریدی ہوئی کتاب کے مصنف نے اپنی کتاب سے نکل کر بروقت

اس کے ایمان کو تزلزل سے بچا لیا۔

اور وہ یہ سوچتا ہوا اپنے گھر کی سمت چل پڑا۔

"کہ اس اور سواستک ایک ہیں"

"سمندر اپنا دکھ نہیں جانتا"

"زندگی ایک عذاب ہے مسلسل تنہائی"

"چہرے کھو گئے ہیں بے چہرگی کی بھیڑ میں"

اور جب ان خیالات کے جھومیں وہ اپنے گھر میں داخل ہوا تو اسے

یاد آیا کہ۔

اس کی بیوی سخت بیمار ہے اور وہ اس کی دوا لانے نکلا تھا۔

⁂

"آئینوں کا شہر"

بے شمار خشک بالیوں نے ہمارے سرسبز خوشوں کو کھا لیا ہے۔

اور خواب اندھے کنوئیں کے اندر محفوظ ہو چکے ہیں۔ اب صرف خواب کی تعبیریں ہیں اور سروں پر لٹکتی ہوئی تیز نوکیلی تلوار۔

لیموں کی بجائے انگلیاں تراشنے کا فن لوگ ایک بار پھر فراموش کر چکے ہیں۔

"یارو! آؤ کہ ہم خود فراموشی کا جشن منائیں"

زمین سے آسمان کے سفر کا قصہ حقیقت ہو چکا ہے کہ اپالو کے FIRE ہونے کی آواز کی موسیقی نغمۂ سرمدی اور لحن داؤدی سے بھی فزوں تاثیر کے ساتھ باعث وجد و بے خودی ہو رہی ہے۔

"رفیقو! آؤ ہم اس معراج کی خوشی میں TWIST

"آسمان سے پرے کیا ہے؟"

"صرف آسمان"

"اتنے آسمان کہ خواب میں جتنی خشک بالیاں ہری بالیوں کو کھاتی نظر آتی تھیں"

لیکن اعداد شمار واپس آ کر صفر میں سما گئے ہیں۔

دیکھو تو! سر کے اوپر صرف درخشاں صفروں کا خیمہ ہے۔
دوستو! آؤ! ہم خوشی میں سارے غموں کو پی جائیں۔"

"جشن اور خوشیاں منانے والے یہ کون لوگ ہیں؟"
اس نے مور سے پوچھا اور مور نے لیلیٰ سے۔ اور لیلیٰ نے اپنی آنکھوں
میں سوال کا سرمہ لگا کر اسکی طرف دیکھا۔
وہ خاموش رہا۔
واقعی یہ کون لوگ ہیں۔ جنہیں وہ نہیں پہچانتا۔
سامنے سیاہ کوؤں کی ایک قطار اڑتی چلی گئی۔ پھر اسے اپنے
سر میں پتھر سے لگی ہوئی کبھی کی ضرب کی یاد تازہ درد بن کر ابھرتی محسوس
ہوئی۔
اس نے لیلیٰ کو بہت غور سے دیکھا۔
"کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ مسکرا کر اور خوبصورت ہو گئی۔
"کچھ نہیں — تم لیلیٰ ہو نا!"
"تم کبھی کبھی ایسی بہکی باتیں کیوں کرنے لگتے ہو۔"
"میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔"
وہ بے تحاشہ ہنسی۔ "سر دبانے کی بے وقوف رسم ختم ہو چکی ہے۔
"لو یہ PILL لے لو۔"
"نہیں! تب میں سو جاؤں گا۔ اور یہ پتہ نہیں چل سکے گا کہ جشن منانے
والے یہ کون لوگ ہیں۔"

اور وہ بڑی سرعت سے ایک سمت چلا گیا۔

بیلی تنہا رہ گئی۔

لیکن جب راتیں پہاڑ بن گئیں اور دن صدیاں۔ اور پھر بھی وہ واپس نہیں آیا تو بیلی اس کی تلاش میں نکلی۔

اس کے سامنے بے رحم چہروں کا دسیع سمندر تھا۔ اور اسکو عبور کرنے کی کوئی شکل نہیں تھی۔

بیلی نے سوچا: کاش! وہ ہوتا تو کہیں سے کوئی کشتی ہی آجاتی یا پھر سمندر کا پانی دو طرفی دیواریں بن کر اسے راستہ دیدیتا۔

لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔ اور تب مجبور ہو کر اس نے خود کو پانی کے حوالے کر دیا۔

اور وہ سیلِ رواں پر تنکے کی طرح بہنے لگی ۔ گرداب میں گھومتی رہی۔ گھومتی رہی ۔ دائرہ سے نکلنا مشکل تھا۔

اس نے سوچا وہ واپس چلی جائے۔ لیکن واپسی ممکن نہیں تھی۔

لہروں کے تیز بہاؤ کو کاٹ کر پیچھے کی طرف مڑنا ناممکن تھا۔

تھک ہار کر اس نے خود کو لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

پھر کچھ وقفہ کے بعد اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو سامنے ایک ایسی جگہ تھی جس کے آسمان و زمین آئینے کے تھے اور چاروں سمت صرف آئینہ کی دیواریں تھیں،

اور وہاں سچے میں بیلی نے صرف خود کو پایا۔

صرف وہ ۔ صرف بیلی

"وہ کون ہے؟"

"میں ہی تو ہوں۔"

"اور وہ؟"

"میں۔"

لیلیٰ گھبرا گئی۔ آخر کتنے ٹکڑوں میں بکھر کر میں آئینہ خانہ میں گم ہو گئی ہوں۔

"لیکن میں خود کہاں ہوں؟"

"میرا وہ کہاں ہے؟"

لیکن اس آئینہ کے شہر میں نہ تو وہ خود تھی اور نہ اس کا وہ،

اور یوں جب وہ خود کو بھی کھو چکی تو وہ اپنی تلاش پر روانہ ہوئی۔

اس نے خود کو اپنی سوچ کی تیز لہروں پر، اپنی فکر کے تند بہاؤ پر خود کو بہنے دیا۔

اور اُدھر لیلیٰ کا وہ ریگ زار میں پھیلے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پر کچھ تلاش کرتا رہا۔

ایسا لگتا تھا جیسے اسکی کھوئی ہوئی یادداشت واپس آگئی ہو۔

"ہاں! ہاں! یہ وہ پہاڑ ہے۔ جہاں میں آچکا ہوں۔ یہ وہ چوٹی ہے جہاں میں نے لیلیٰ کو حاصل کرنے کی کوشش میں تندرہیشی کی تھی۔"

پھر کیا ہوا تھا۔ اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا۔

پہاڑ پر اور پہاڑ کے دامن میں قدموں کے جو نشانات تھے ان پر اس نے اپنے پیر دل کو رکھ کر دیکھا

"یہ تو خود اس کے ہی ہیں!"

پہاڑ کے نیچے جو تاریک کھائی تھی۔ اس میں ڈرتے ڈرتے جب اس نے
جھانکا تو وہاں خود کو انجیر کے پتے سے اپنا تن چھپائے موجود پایا۔

"میں وہاں ہوں!"

"تو میاں پہاڑ کی اس رفعت پر کون ہے — میں؟"

اس نے محسوس کیا کہ اس کے جسم پر جو زرق و برق لباس تھا وہ اتر
چکا ہے وہ ننگا ہے۔

اس نے اپنے برہنہ جسم کو چھپانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہاں سے
پتھر ملا۔ لوہا ملا۔ اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔

اور پھر اس نے محسوس کیا اس کے جسم پر بہترین کپڑوں کی پوشاک ہے۔
اس نے ایک بار پہاڑ کی چوٹی سے نیچے دیکھنے کی کوشش کی تو نیچے ٹیڑھی
میڑھی پگڈنڈیوں پر خوبصورت شاہراہوں پر عجیب و غریب شکلوں میں وہ
خود چلتا نظر آیا۔

"ہائیں! کیا یہ سب کا سب میں ہوں۔ سنہرے زمانہ کی سنہری گرد میں
چمکتا ہوا۔ سیاہ زمانہ کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا"

اس نے حیرت میں آ کر خود کو چھوا۔ خود کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔

"میں کہاں ہوں"

"میری لیلیٰ کہاں ہے؟"

لیکن وہاں صرف چٹانوں پر وقت کے ٹکرانے کی آواز تھی۔ اور خود
اسکی اپنی آواز کی بازگشت۔

واپس ہوا تو سامنے وہی آئینوں کا شہر تھا۔

"لیلیٰ"۔

دوڑ کر اس نے اسے پکڑ لیا۔

"مجھے چھوڑ دو... میں... لیلیٰ نہیں ہوں۔

"تم... لیلیٰ ہو؟"

"نہیں

لیکن تم سب کی سب لیلیٰ ہو۔"

یہ کیا جھوٹ ہے۔ اسکا سر چکرا گیا۔

اور پھر جو اس نے دیکھا تو سامنے جشن اور خوشیاں منانے والوں کے جلوس میں بے شمار لیلائیں تھیں اور بے شمار وہ خود۔

*

پیاسا دریا ـــــ بھیگا صحرا

ایک روز دفتر جاتے ہوئے راہ میں اس نے سوچا تھا کہ زندگی ایسی شراب ہے جو کسی کے لئے امرت بن کر آسمان سے اترتی ہے اور کسی کے لئے زہر۔

"لیکن تم شنکر تو نہیں جو اس زہر کے پیالے کو جان بوجھ کر ہونٹوں سے لگائے رکھو۔ تم تو محض ایک عورت ہو۔ لغزشوں اور کمزوریوں کا دھڑا دیپ"۔

یہ بات اس نے کسی سے کہی نہیں تھی۔ بس یونہی ہوا تھا کہ یہ بات اسکے ذہن سے نکلی تھی اور دل میں سما گئی تھی۔

اس نے پہلی بار جب اسے دیکھا تھا تو وہ ایک پرسکون جھیل کی مانند نظر آئی تھی۔ صاف، شفاف اور ہموار۔ لیکن ہموار سطح آب کے نیچے بے شمار سلوٹیں بھی ہوتی ہیں شاید۔ ناہمواریاں اور پیچ و خم بھی!

کیوں کہ جب اس نے اسے قریب سے دیکھا تو اب لگا جیسے اسکے شاداب اور پرکشش جسم کے اندر بہت تیز آگ سی لگی ہوئی ہو۔

شاید وہ اسکے جسم کو چھو بیتا تو خود بھی جل جاتا۔ یا پھر وہ آگ اسکے اندر منتقل ہو جاتی۔

لیکن نہ جانے کیوں اس کے کندن کی طرح روشن جسم کو چھو لینے کی خواہش کی تیز آنچ میں وہ بھی سلگنے لگا تھا۔

کبھی کبھی تو اسے ایسا لگتا جیسے وہ خوبصورت عورت اپنی کالی کالی آنکھوں میں شمع جلائے اسے اندر سما جانے کا اشارہ دے رہی ہو۔

"آؤ ـــــــ مجھ میں سما جاؤ۔"

اسکے جسم کے سارے تار اس دن بج اٹھے تھے جب وہ اپنی بہن کے لڑکے کی انگلی پکڑے اسکے پاس اسکی ٹائی واپس کرنے آگئی تھی۔

"میں شرمندہ ہوں۔ یہ بہت شریر ہوتا جارہا ہے۔"

وہ جنوری کی گرم اور سنہری دھوپ میں نہا کر اور سنہری ہو رہی تھی۔ "بچہ ہے۔" اس نے کہا۔

لیکن وہ اسے اس طرح دیکھتا رہا جیسے وہ گوشت کا گرم گرم روسٹ ہو جس سے اشتہا انگیز بھاپ نکل رہی ہو۔

اور جب وہ دفتر میں آ بیٹھا تو اسے ہوش آیا۔ "اسے اس عورت کے متعلق سوچنے کا کیا حق ہے۔ وہ روسٹ ہو یا کباب۔ اسکو کیا۔ وہ کسی اور کا حصہ ہے۔"

لیکن اسی دم میفسٹوفیلس نے اس کے کانوں میں کہا۔

"سنو! وہ گرم گرم گوشت اسی طرح ڈرائی پان میں رکھا ہوا ہے۔ کسی نے اسے چھوا بھی نہیں۔ اس پر چھری کانٹے کے نشانات بھی نہیں ہیں۔ غالباً ہوٹل کے بیرے نے کسی VEGETARIAN آدمی کی میز پر غلطی سے

اسے SEVRE کر دیا ہے۔

اس نے جواب میں سوچا۔

"تو میں کیا کیا کروں۔ بہرحال وہ میرے حصے کی پلیٹ نہیں۔ ہوسکتا ہے میرے آگے پلیٹ لگانے میں بیرے نے غلطی کی ہو۔ لیکن اب کیا ہوسکتا ہے۔ ہاتھ لگا کر پلیٹیں بدلی تو نہیں جاسکتیں۔"

میفسٹوفیلس مسکرا کر چلا گیا تھا۔

"تم بڑے احمق ہو۔ گناہ و ثواب کی باتیں سوچتے ہو۔"

لیکن یہ حقیقت تھی کہ اسکے ذہن پر گوشت و پوست کا وہ شعلہ بدستور چھایا رہا۔

"تم خود سلگتی رہی ہو۔ سلگو۔ جلتی رہی ہو۔ جلو۔ لیکن اپنی آگ میں تم مجھے جلا دینے کو کیوں تیار ہو۔"

اب وہ اکثر سوچتا۔

لیکن جب اس سے باتیں ہوتیں تو ایسا لگتا جیسے اسکی باتوں میں آبشار کی سی تیزی ہو اور شبنم کی سی ٹھنڈک ہو۔

"آپ کے گھر پر سب ٹھیک ٹھاک ہے نا۔۔؟"

باتیں ختم ہونے لگیں تو وہ ہر بار اس سے یہ سوال ضرور کرتی اور اسکا جی چاہتا کہ وہ یہ سوال نہ کرے۔ یا کاش! اس میں ہمت ہوتی کہ وہ بھی اس سے پوچھ سکتا۔

"تم ٹھیک ٹھاک ہونا۔ اور تمہارا گھر۔"

لیکن تب ہی اسے اسکی آنکھوں میں ۔۔۔ یک ۔۔ وزن میں دبی ہوئی

چنگاریاں دکھائی پڑتیں۔ جسم کی خوبصورت کمان ٹوٹتی معلوم ہوتی۔ اور اسکے ہونٹ ماہیٔ بے آب کی طرح پھڑکتے سے نظر آتے تھے۔

"COKE یا 7-UP ؟ کیا پیوگی ؟"

"مجھے ٹھنڈی چیزیں اچھی نہیں لگتیں — میں تو کافی پیونگی"

"زندگی کی تلخی میں کافی کی تلخی گھولتے پر کیوں تلی ہو۔؟" وہ ہنسی۔ "پسند اپنی اپنی"

اور اس کے جسم کا سونا، اس کے روپ کی چاندنی اسی ہنسی میں گھل کر اس کے سارے وجود پر چھا گئی۔

پھر باتیں۔ اور باتیں — اور بہت سی باتیں۔

اور ہر بار اسکی نازک باتیں چڑھتے چاند کی طرح اُسکے ساحل نفس کے قریب تلاطم برپا کر دیتیں۔

اور تب کبھی ایسا ہوتا کہ خواہشوں کی تیز ہوا وُں سے دونوں جسموں کا جنگل سائیں سائیں کرتا معلوم ہوتا۔ لیکن ہوا صرف یہ کہ پانیوں کے سمندر میں نہا کر وہ شانت ہو جاتے۔

کبھی یوں بھی ہوتا کہ خالی لمحوں میں وہ اپنی فکر کے گھنیرے گدّے نیچے آنکھیں موند کر ان لمحوں کی یاد میں محو ہو جاتا جب ایک چاند ہزاروں مہتاب کی ٹھنڈک لئے اسکی آغوش میں آگیا تھا۔

"یہ بندھن تو اب موت کے ہاتھ بھی نہیں توڑ سکتے"

کھنکھناتی چوڑیوں اور مہندی لگے ہاتھوں نے اسکے ہاتھوں پر اپنی گرفت مضبوط کر دی تھی۔

اور آج بھی وہ اسی بندھن میں جکڑا ہوا تھا۔ اور گرچہ مہندی کا رنگ ہاتھوں کے افق پر پھیکا ہو چکا تھا پھر بھی اسکی تحریریں۔ اسکے خطوط ہر ماہ آ آ کر اسے اس بندھن کی مضبوط گرفت کی یاد دلاتے رہتے۔

"منے کا اسکول اسٹرائک کی وجہ سے بند ہے۔"

"چینی کو رات سے بخار ہے۔"

"ماں کے لئے اس بار ایک نئی ساڑی لیتے آئیے گا۔"

وہ سوچتا کہاں سے عشق چلا تھا اور کہاں پہونچا تھا۔

پھینکی تھی چاند تاروں پر کمند اور ہاتھ آیا۔

منے کا اسکول

چینی کا بخار

اور ......

شہر میں اسے کوئی ایسا کمرہ اب تک مل ہی جاتا جہاں وہ اپنے چولہے چکی سمیت گھر گرہستی کی چھاؤں میں شب و روز گذارنے کے قابل ہو جاتا۔ لیکن ایسا لگتا تھا جیسے شعوری اور لاشعوری طور پر اس نے ایسا مکان حاصل کرنے کی کوشش غالباً ترک کر دی تھی۔

چولہے کی آگ بہرحال ٹھنڈی ہی ہوتی ہے۔

اور لہو کی آگ ــــ

"کل ہماری شادی کی سالگرہ ہے ــ آپ کو آنا ہے۔"

باتیں زیادہ نہیں ہوئیں۔ مہیب خاموشی کا کہرا فضا پر مسلط رہا۔ اور وہ چلی گئی۔

اس نے سوچا وہ بھی اپنے گاؤں چلا جائے۔ لیکن۔

"آپ کو آنا ہے۔"

آواز کا عکس اسکے لئے زنجیر بن گیا تھا۔

"اب کیسے جاؤ گے۔"

اور وہ واقعی نہیں جا سکا۔

شادی کی سالگرہ خشک آندھی کی طرح اور طوفان کی طرح چلی گئی۔

اور وہ صحرا کی طرح جہاں تھی وہیں رہی۔ اور جیسی تھی ویسی ہی رہی۔

"چلو آنس کینڈی کھائیں۔" وہ اپنے آپ کو سمیٹ کر بولی تھی۔

"کیوں؟ تمہیں تو گرم اور کرارہی کافی پسند ہے۔"

"وہ تو ہے ـــــ وہ تو میری قسمت ہے۔"

"آؤ چلو۔" وہ بولا۔

"نہیں! چھوڑو ـــ برف سے پیاس اور بڑھ جائیگی۔"

کافی دیر تک وہ سڑکوں پر بے مقصد گھومتے رہے۔

"تمہارے خاوند کل ہی چلے گئے۔"؟

"ہوں۔"

"کیوں؟"

"ضروری کام تھا۔"

"رک جاتے تو کیا ہوتا۔"؟

"آسمان گر جاتا۔"

افسوس ہوا کہ اسنے یہ پوچھ کر اسے کیوں تکلیف دی۔

جب کہ وہ جانتا تھا کہ اسکا خاوند بر سبب سے صرف شادی کی سالگرہ پر ہی آجانے کی رسم ادا کر رہا تھا۔

کیوں ۔۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

پھر اس نے گفتگو کا رخ بدل کر بات سیدھے راستہ پر ڈال دی

"ویران سڑکوں پر یوں خالی خولی کب تک دوڑتی رہوگی"

"سڑکیں ویران ہوتی ہیں کیا ۔۔؟ ویرانی تو اپنے اندر ہے۔"

"فلسفی مت بنو ۔۔ فلسفے سے کسی کو کچھ نہیں ملتا"

جواب میں وہ کچھ نہیں بولی۔

اس نے پھر پوچھا۔

"تم نے سنا نہیں ۔؟ ویران سڑکوں پر یوں خالی خولی . . ."

وہ بات کاٹ کر بولی۔

"خالی خولی کہاں ہوں ۔۔ آپ بھی تو ساتھ ہیں"

وہ یکا یک رک گیا

"میں . . . . . کیا میں . . . . . !"

پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کر اپنے سامنے کر لیا اور اسکی آنکھوں میں اپنی آنکھیں اتار دیں ۔

"سنگ ملامت کی تاب لا سکوگی"

وہ بے تحاشہ ہنسی

سڑکوں پر دوڑنے پھرنے سے میں خائف نہیں ہوتی"

اور وہ اسکی آنکھوں میں ٹپکنے والے لہو کو تلاش کرتا رہا۔

لیکن ان آنکھوں میں صرف طویل انتظار کی لرزش تھی۔ اور سب

کچھ سہہ جانے کے نشہ کا خمار

اور اسکا وجود شبنم میں نہایا ہوا تھا۔

آسماں، راہ گذر، شیشۂ مئے

گدڈ مڈ خیالوں کے الجھے راہ گذر پہ ملگجی شام کا سلونا سایہ تھا۔ اور فضا خیالِ رخ یار سے دھندھیا ہو رہی تھی۔

"تم آؤ تو ۔۔ آتو جاؤ کہ زنگا ہوں کا یہ دھوکا خیالوں کا یہ سراب ختم ہو"

لیکن یہ آواز سکوت کی راگنی میں دب کر رہ گئی۔

کوئی نہیں کوئی بھی تو نہیں آیا۔ گرچہ ہر تارِ نفس میں آرزو بیدار تھی۔ اور دل کی فسردہ خلوت میں تمنا کی قندیلیں روشن تھیں۔

وہ دھواں دھواں شام کتنی ہی اداس شاموں اور بے کیف شب دردز کی طرح پھیلی جا رہی تھی لیکن نقودِ گل لباس بجاز نہیں مل سکا تھا۔

پھر یکا یک دل کے بے خواب کواڑوں پہ دستک ہوئی۔

"کون ہے"

"میں آگہی ہوں۔ لو میں آگئی"

لیکن وہاں تو کوئی نہیں تھا۔ اُسکی اپنی آواز ریگ زار میں بھٹکتی رہی۔

"میں ہوں۔ لیکن میں ہوں۔ تمہاری رگِ جاں سے قریب۔ تمہاری سوچ کی بہشت میں موجود۔"

"لیکن تم کون ہو؟"

"تعجب ہے تم اپنے وجود کے ایک جزو کو نہیں پہچانتے۔"

"مجھے بتاؤ تم کون ہو آخر۔ میرا دل اسی طرح سونا ہے۔ میرے خیال کا راہ گزر یوں ہی ویران اور میرا وجود ہمیشہ کی طرح تنہا۔"

"غلط۔ تم غلط کہتے ہو۔ تم ہی نے تو مجھے مانگا تھا۔ میں کہاں تھی۔ میں تھی کہاں۔ تم ہی نے تو مجبور کیا اور پھر میں......"

اب تو ایسا لگتا ہے جیسے میں سب کچھ یاد کر کے بھی بھول گیا ہوں۔ البتہ اتنا ضرور مجھے معلوم ہے کہ ایک انجانی طلب ایک غیر مانوس خواہش میرے وجود کی خمیر بنی تھی۔ اور میں اپنی پہلی خواہش کا شکار اور اپنے ہونے کی مجبوری کا مذاق۔ بالکل اسی طرح آج بھی موجود ہوں۔"

پھر تھک کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور ذہن کے پیالے سے خیال و آرزو کی ساری شراب وہیں زمین پر انڈیل دی۔

تب اسے وہ باغ یاد آیا۔ اسکی معطر و مقدس فضا یاد آئی اور کوثر و تسنیم کے چشمے کی طرح نرم روی سے گذرتی ہوئی اسکی زندگی۔ لیکن اسی لمحہ اسے کسی آتشیں سانپ کی پھنکار میں چھپی یہ آواز سنائی دی۔

"مٹی کہیں سر بلند ہو سکتی ہے؟" مٹی کی جگہ آسمان میں۔"

اور وہ دن اور آج کا دن تب اور اب۔ صدیاں اور ماہ و سال۔

لیکن سب کچھ بول کر بھی اسکے اپنے اندر کی دنیا وہی تھی۔

"تم اس لڑکی سے شادی نہیں کر سکتے۔ کہ یہ تمہارے شاہی خاندان کی روایت کے شایانِ شان نہیں"۔

"مجھے اپنی خواہش کا احترام ہے۔ میں شاہی روایات کا احترام نہیں کر سکتا"۔

اور وہ اپنی جانِ آرزو کو گلے لگائے تخت سے نیچے اتر گیا تھا۔ لیکن وہ محض حماقت تھی۔ کیوں کہ لڑکیاں محض ٹائپ رائیٹر ہیں جب تک چاہو ان پر اپنی اولاد کے نام ٹائپ کرتے جاؤ۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔ اور بس۔

تم جو چاہو کہو لیکن میں سمجھتا ہوں ہمارے وجود کا مقصد ہماری زندگی کا محور بس وہ ایک طلب ہے۔ وہ ایک تمنا جس سے بہشت کی بہار بنتی ہے۔ اور بن باس میں بھی پھول کھلتے محسوس ہوتے ہیں"۔

"وہ اگر ٹھیک ہے۔ تو تم ہی سوچو تم نے اس چکر میں کیا کھویا اور کیا پایا"؟

"سود و زیاں کی میزان میرے پاس تو نہیں لیکن یہ ایسا کیوں ہے مجھے بھی نہیں معلوم"۔

اسکے دوسرے دوست نے اسکی طرفداری کی۔

ہاں بھائی RELIGION OF BlOOD بھی تو کچھ ہے"۔

اسکے پہلے دوست نے جواب دیا۔

"کچھ بھی نہیں محض ایک سفلاپن"۔

اس نے اپنے خیال کی آنکھیں بند کر لیں اور کھلی آنکھوں سے اپنے ارد گرد دیکھا۔ اسے دنیا روایتی طاؤس کے پیروں کی طرح بدہیبت اور بیکار سی لگی۔

لیکن وہ باتیں جو اسکے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح جمع ہو گئی تھیں انہوں نے اسے ایک بار پھر یاد دلایا کہ زندگی پرستش و عبادت کا نام ہے۔ زندگی جہد مسلسل ہے۔ اور وہ سب کچھ نہیں جو وہ سوچتا آیا تھا۔ اور جس کی چاہ اس نے کی تھی۔

اور تب اسے خود کو بھی بھول جانے کی کوشش کی تھی۔ اور شاید خود کو بھول بھی گیا ہوتا۔

اگر ایک شام۔

نجانے کیا ہوا تھا۔ لیکن کچھ ہوا تھا۔ اور پھر شامیں بے حد خوبصورت ہونے لگی تھیں اور یوں لگا تھا جیسے زندگی کو کوئی مقصد مل گیا ہو۔

"شانو! تم نے مجھے پہچانا۔؟"

وہ بے تحاشہ ہنسی تھی۔

"کیا مذاق ہے۔ اب نہ پہچاننے کا سوال ہی کہاں ہے۔"

لیکن وہ شانو کو کس طرح سمجھاتا کہ وہ سوال اس نے اپنے آپ سے کیا تھا۔

شانو بولی۔

"تم قریب ہو کر بھی کبھی کبھی کتنے دور لگنے لگتے ہو۔"

ایسا لگا جیسے اسنے شانو کی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ تو اپنی پسلی کے قریب کچھ خلش سی محسوس کر رہا تھا۔

ہاں یہ تو وہی ہے۔ بالکل وہی۔ آج اور کل میں کوئی بھی فرق تو نہیں۔

اسے یاد آیا کل جب وہ ہجوم شوق میں گھرا اس خلش کو نام دینے کی کوشش کر رہا تھا تو نہ جانے کہاں سے ایک ایسی آواز آئی تھی جس نے اسکے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

"عجیب ہو تم۔ تمہیں سب کچھ میسر ہے پھر بھی۔۔۔۔۔"

"میں خود حیران ہوں کہ مجھے کیا چاہیئے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ میرا سارا وجود کسی عجیب و غریب طلب کے آزار میں مبتلا ہے۔"

جواب میں وہ آواز تو خاموش تھی لیکن قریب ہی ایک عقابت سے بھرے لیکن فتح سے سرشار سرکش قہقہہ نے آسمان سر پہ اٹھا لیا۔

اُسنے دیکھا آسمان میں ایک ستارہ ٹوٹ کر دور تک گرتا چلا گیا۔ شانو خوف سے اسکے پہلو میں سما گئی۔

اور اُسنے اپنے پہلو میں ہاتھ بڑھا کر شانو کے وجود کو محسوس کیا۔

شانو تمہیں پا کر میں دو جہاں کو بھول جانے کی قسم کھا سکتا ہوں۔ اور واقعی ایسا ہوا۔ شانو کو پا کر وہ سب کچھ بھول گیا۔

اپنا فرض۔ اپنا عہد اور بہت کچھ۔

"پھر ایک روز جب ماحول بڑا ہی خوشگوار تھا۔ اور چاندنی شراب برسا رہی تھی۔ تو شانو نے اسکے شانوں پر اپنی ٹھوڑی رکھ کر

شہد بھری آواز میں اس سے کچھ کہا تھا۔

"نہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔"

شانو ہنسی۔

"اسے پی کر دیکھو ہم دونوں جاوداں ہو جائیں گے۔"

"ارے نہیں شانو۔ یہ غلط ہے۔ ہم اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔"

"تو پھر تمہاری چاہ جھوٹی ہے۔"

"نہیں شانو یہ الزام تو نہ دو۔ کیوں کہ تمہارے حکم سے بڑھ کر...... میں کیسے بتاؤں! میں نے اگر اسے منہ سے لگایا تو میں اس گھر سے نکال دیا جاؤں گا۔"

شانو اس سے روٹھ گئی۔ یوں لگا زندگی اس سے روٹھ گئی ہو۔

"شانو تم بے حد حسین ہو۔ حوروں سے بھی زیادہ حسین۔" شانو کے کان میں پتہ نہیں کون یہ بار بار کہتا رہا تھا۔ اور شانو نے جب اپنی تعریف کے نشہ سرشار ہو کر اپنے سراپا کو آئینہ میں دیکھا تو اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ فردوس کی ملکہ ہو۔ اسکا سر غرور سے اونچا ہو گیا تھا۔

"میں عورت ہوں صرف آدم کے دل کی ملکہ نہیں۔ ساری کائنات کی مسجود۔ میں خود کائنات ہوں۔"

"تم نے ٹھیک ہی سوچا۔"

شانو نے گھوم کر اسکی طرف دیکھا۔

"وہ نو یہ تم ہو۔ اگر سب کچھ چھوڑ کر مجھے اپنا لینے کی ہمت نہیں تو

تو دودھ پیتے بچے کی طرح اپنے باپ کا حکم مانتے رہو۔"

"شانو سنو تو"

میں کیا سنوں۔ یہ کھاؤ۔ یہ نہ کھاؤ۔ یہ پیئو۔ یہ نہ پیئو۔ یہ کیا زندگی ہے۔ بندشوں میں جکڑی ہوئی۔"

"تمہاری آنکھوں کے پیمانے کافی ہیں میرے لئے شانو۔" لیکن جب تک شانو شیشہ مئے سے اپنے لب لگا چکی تھی۔

"لو نہ" عجیب نشیلی آنکھوں سے شانو نے اسکی طرف دیکھا۔

"لو بھی۔ میں نے اس میں اپنے لبوں کی شیرینی گھول دی ہے۔"

وہ گھبرا گیا۔ ایک طرف شانو تھی۔ اسکی نشیلی آنکھیں۔ اُس کی میٹھی آواز۔ اسکے زلفوں کی ٹھنڈک۔ اسکے قرب کی گرمی۔ اور دوسری طرف۔ صحرا کی مانند ویران اور اجاڑ زندگی۔

ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا اس نے شانو کو پانے کی خواہش ہی کیوں کی تھی۔

اف۔ وہ اسکی پہلی خواہش۔

پھر یوں ہوا کہ اسکی سوچ پر لگائے ہوئے تمام پہرے ہٹ گئے اور وہ شانو کی بڑی بڑی آنکھوں کی شہ پاکر پی گیا اور پیتا چلا گیا۔

لیکن جب نشہ ٹوٹا تو شانو نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ اور خواب کا وہ طلسمی باغ بھی غائب تھا۔ اور تلخ حقیقت کی سنگلاخ زمین اسکی پیٹھ میں چبھ رہی تھی۔

افق تا افق اس نے شانو کی تلاش کی۔ اسکی جستجو میں حلا دھن

ہوا۔ پتھر کھائے۔ پہاڑ کاٹے۔ تخت و تاج چھوڑا اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔ لیکن ہر بار شانتو اسکے ہاتھ آ آ کر بھی اسکی گرفت سے نکل جاتی رہی۔ کئی جگ بیت گئے۔ اور وہ تھک کر رہ پڑا۔

"شانتو کہتے روپ بدل کر تم مجھے جنم جنم تک دھوکا دیتی رہو گی اور میں یوں ہی سوتا، ویران اور تمہاری زندگی کی خاردار صلیب پر لہولہان پڑا سسکتا رہوں گا۔ شانتو میں اب لوٹ جانا چاہتا ہوں اپنے گھر جہاں خوبصورت باغ ہے۔ دودھ اور شہد کے چشمے ہیں لیکن مجھے وہ راہ نہیں ملتی۔ اور جب کبھی اس راہ کی تلاش کا قصد کرتا ہوں تو یہ کیا ہے شانتو کہ تم پھر اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ میری نظروں کے سامنے آجاتی ہو اور پھر سب کچھ گڈمڈ ہو جاتا ہے۔"

ایک تصویر دو رُخ

"نیند اس کی ہے، راتیں اُس کی ...... زلفیں پریشاں ہو گئیں"۔
چاند شرما گیا اور زلفوں کے سیاہ بادل کسی کی محبت بھری گرفت سے
نکل کر اس پر چھا گئے۔

"بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے!"

"نہیں موتنا، ایسی بات نہیں۔ یہ حقیقت ہے۔ ایک ایسی حقیقت
جس پر میں دانستہ پردہ نہیں ڈال سکتا۔"

"جی ہاں! شاعری کا جوڑ فلسفے ہی سے تو ہے۔"

چاند بادل سے نکل آیا تھا۔

"موتنا! تم کیا جانو ان [illegible] کو لیکن میں سچ کہتا ہوں۔ تم نے
میری زندگی کو یکایک بہار سے ہم کنار کر دیا ہے۔"

"اور میری زندگی کے ویران دامن میں بھی پھول آنے لگے ہیں۔"

"سچ! سچ موتنا! تو پھر میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں، دنیا میں شاید ہی ایک
دو شادیاں اتنی کامیاب ہوتی ہوں گی۔"

"میں بھی تو یہی سوچتی ہوں۔"

"تم سوچتی ہو میں محسوس کرتا ہوں۔ مجھے تعجب ہے کہ تم میرے تصور کے مبہم گوشوں سے بالکل اسی طرح حقیقت کے لباس میں کیونکر سامنے آگئی ہو۔ ہو جانتی ہو مونا! میرے اچھے ناولوں اور کامیاب کہانیوں کی حسین ہیروئنیں تم سے ملتی جلتی ہیں۔"

"آپ کہانی کار ہیں۔ اس لئے آپ نے اتنی سی بات کو کہانی کا روپ دے دیا ہے۔"

"لیکن یہ کہانی نہیں، افسانہ نہیں، یہ حقیقت ہے۔"

اور چاند بادلوں کے بالے میں آگیا۔

گاڑی رک گئی تھی۔ چھوٹا سا پہاڑی اسٹیشن۔ دم توڑتی ہوئی سرد اور مدھم، ڈوبتی ہوئی چاندنی کی چادر میں ملفوف ایک مہیب پر سکوت لیکن جذبات انگیز منظر پیش کر رہا تھا۔

دونوں گاڑی سے اتر گئے۔ اور قلی کی رہنمائی میں ویٹنگ روم کی طرف پہاڑی مقام کی خنک ہوا کے تیروں سے بچنے کے لئے بڑھنے لگے۔ سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم بالکل خالی تھا۔ نئے نئے فرنیچر اور دیوار کا نصف چمکتا ہوا موزیک کیا ہوا حصہ بتا رہے تھے کہ اس کا وجود حال ہی میں عمل میں آیا ہے بستر کھولنے کی زحمت نہیں کی گئی۔ اسلئے کہ دم توڑتے ہوئے ستاروں کے چراغ تھرتھرا رہے تھے۔ اور صبح ہونے ہی والی تھی۔

"اس وقت یہاں چائے مل سکتی ہے؟"

"ایک گھنٹہ بعد!"

قلی کا مختصر جواب تھا۔

اور پھر ایک گھنٹہ گزر جانے میں دیر ہی کیا لگی ؟ صبح کی پہلی کرنوں کے ساتھ اس چھوٹے سے پہاڑی اسٹیشن پر زندگی جاگ اٹھی تھی۔ لیکن مونا اپنے جسٹر میں دونوں ہاتھ ڈالے، اس کے سینے پر سر ٹکائے سو رہی تھی۔ اور وہ ساکت وجامد بیٹھا اس کے چاند سے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا، دو تین دنوں ہی میں اس کی اپنی زندگی کتنی بدلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جو ہفتوں شیو کئے بغیر گھومتا رہتا تھا۔ وہ جو نہ تو کپڑے کی تبدیلی اور کپڑے کی سلیقگی کو ہی ضروری سمجھتا تھا۔ وہ جو شیلی کی خیالی دنیا میں اسکے تخیل کے شہپروں کے سہارے گھومتے اور گھومتے رہنا ہی جانتا تھا۔ وہ جو پریم چند کی بستی اور دیہاتوں کا دلدادہ تھا۔ اور جو ہنری اور چیخوف کی دنیا میں کھویا رہنا پسند کرتا تھا۔ اور جو کہانیاں لکھتا تھا۔ وہ جو سگریٹ پیتا نہیں دھونکتا تھا۔ اور سگریٹ کے دھوئیں کے ہر مرغولے کے ساتھ ایک نیا کردار ایک انوکھا ہیرو اور ایک حسین ہیروئن کی تخلیق کرتا تھا۔ وہ جو ایک فنکار تھا، ایک خالق، زندگی کا لازوال اور ابدی لذتوں سے بے بہرہ خالق اور فنکار!

لیکن ان دو تین دنوں میں اس نے ایک ایسی چیز پالی تھی جس نے اسے شاعروں اور فنکاروں کی خیالی دنیا سے نکال کر حسین اور روشن حقیقت سے روشناس کرا دیا تھا۔ اجنتا اور ایلورا کے لاجواب فن پاروں اور فنکاروں کے حسین تصور، اور تخیل کی بلند پروازی سے بھی بڑھ کر حسین ترین حقیقت خود اس کے سامنے آگئی تھی جو نہ تو ان قدیم غاروں کی خوبصورت مورتیوں کی طرح بے جان تھی۔ اور نہ ہی اسے اور اس کے وجود کو صرف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ بلکہ اب تو وہ بہت قریب سے اس کے سانسوں کی گرمی

محسوس کر رہا تھا۔ اور اس کے سینے کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ اس کے اپنے دل کی دھڑکنیں بھی ہم آہنگ ہو رہی تھیں۔

اور یکایک دہرہ دون ایکسپریس کی آمد کی شور سے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور وہ اپنی بوجھل آنکھوں کو ملتی ہوئی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"صبح ہو گئی؟"

"ہاں صبح ہو گئی!"

وہ شاید اپنی زندگی کے متعلق سوچ رہا تھا۔

"صاحب! بس آ گئی ہے" قلی نے آ کر اطلاع دی۔ اور وہ دونوں ہی بینچ چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

ہوٹل ڈی رون کے ڈبل سیٹڈ ۲۲ نمبر کا کمرہ کا تالا کھول کر جب ان دونوں نے اندر قدم رکھا تو انہیں اس کا احساس ہونے لگا کہ وہ رات بھر کے بھوکے بھی ہیں۔ اور رات بھر کے جاگے ہوئے بھی۔

کھانا کھا کر مونا تو پھر سو گئی۔ اس کی آنکھیں کھانے کے دوران بھی نیند سے بوجھل ہوتی جا رہی تھیں۔

اور وہ پاس ہی آرام کرسی پر جھول گیا۔ اس کا پرانا ساتھی سگریٹ اس کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ اور اس کا دماغ پھر پرواز کے لئے پر تولنے لگا تھا۔ بلکہ اس نے پرواز کرنا شروع کر دیا تھا۔ کہیں اور۔ حقیقت سے پرے۔ ڈوب اپنی اس دنیا میں جہاں حسین اور رنگش حقائق سے بھی زیادہ حسن اور رعنائیاں بکھری ہوتی ہیں۔ وہ خیالات کی بلند اور پر کیف فضاؤں میں پرواز کرتا کرتا کبھی سوئی ہوئی مونا کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔

مونا! جس کے متعلق اس نے کہا تھا کہ "تم نے یکایک میری زندگی کو بہاروں سے ہمکنار کر دیا ہے"۔ لیکن اس وقت اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اتنی بلندی سے اُسے صرف اس کے دُھندلے نقوش نظر آ رہے ہوں۔ وہ چاہتا تھا کہ یکایک اس خلاء سے نکل کر مونا کے حسین، نازک پلکوں کو چوم لے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کی اتنی بڑی کمزوری تھی۔ یہ اتنا بڑا مرض تھا اس میں اسی سے چھٹکارا پانے کے لئے ہی تو اس نے بہت سوچ بچار کے بعد شادی کر لی تھی۔ وہ سمجھتا تھا یہ تخیل کے شہپروں پر اُڑنے کی عادت اور خیالی دنیا میں کھو جانے کی بیماری کا علاج اپنی زندگی کے خلا کو پُر کر لینے سے ہو سکتا تھا۔ اور اس کے اس خیال کو تقویت اس کے دوستوں نے بھی پہنچائی تھی۔ اس کے دوست اس کی بڑھتی ہوئی کھوئے کھوئے سے رہنے کی عادت سے تنگ آچکے تھے۔ اسے یاد تھا وہ یک بار اپنے دوستوں کے ساتھ چاندنی کا لطف اٹھانے آگرہ گیا ہوا تھا۔ "تاج کی حسین اور لافانی عمارت چاندنی میں نہا کر ایک ایسا جوگ بن گئی تھی جس نے اس کے ذہن کے کئی دریچوں کو کھول دیا تھا۔ اور اسکے تخیل اور تصور کے کتنے ہی تاریک گوشوں میں روپہلی چاندنی رینگ آئی تھی۔ اس نے شاہجہاں کو دیکھ لیا تھا۔ ممتاز محل اس کی آنکھوں کے سامنے آگئی تھی۔ اور اس نے ان کی محبت کی گرمی کو بھی محسوس کیا تھا۔ اور پھر اسے ایسا معلوم ہونے لگا تھا۔ جیسے اس کا وجود، اس کی روح تاج میں گم ہو گئی ہو۔ تاج محل۔ وہ۔ چاندنی اور جمنا کا کنارہ۔ پھر یکایک اُسکے دوست اسے تلاش کرتے کرتے وہاں پہنچ گئے تھے۔ جہاں وہ چپ چاپ دیوار سے لگا ہوا کھڑا تھا۔ دوستوں کے شور اور ہنگاموں سے اس کے خواب

منتشر ہو گئے۔ اور پھر جب اُسے اپنی حالت کا احساس ہوا تو اُسے بہت خفت سی محسوس ہوئی تھی اور ایک خوف بھی سما گیا تھا۔ کہیں اس طرح سوچتے وہ پاگل نہ ہو جائے پھر اس نے لکھنا بند کر دیا۔ تنہا رہنا ترک کر دیا وہ قصداً دوستوں میں گھرا رہنا چاہتا تھا۔ پھر بھی وہ ایک لمحہ کے لئے ہی وہ اس جگہ چلا جاتا تھا جسے دیکھتے دیکھتے، جسے سوچتے سوچتے وہ پاگل ہوا جا رہا تھا۔ پھر بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کونسی جگہ ہے وہ کون سا خیال ہے، وہ کون سی آرزو ہے جسے وہ چھونا چاہتا ہے۔ جسے پکڑنا چاہتا ہے۔ جسے لباس مجاز میں دیکھنا چاہتا ہے

اور یہ سب سوچتے سوچتے اس نے شادی کر لی۔ ڈرتے ڈرتے جب اس نے پہلی رات دلہن کا گھونگھٹ اٹھایا تھا تو اسے ایسا معلوم ہوا تھا جیسے درحقیقت اسے اسی چیز کی تلاش ہے جس کی آرزو، جس کی تمنا اسے حقیقت سے پرے کہیں اور لے جاتی تھی۔ اور وہ عجیب عجیب ناموں سے اسے موسوم کرتا رہا۔ لیکن یہ سب زیادہ دن نہیں رہا۔ اس نے کتابیں چھوڑ دی تھیں۔ لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ پھر بھی اسے ایسا معلوم ہونے لگا تھا، جیسے اُس کے کمرے میں سجی ہوئی کتابوں سے نکل کر شیلے، ورڈز ورتھ، اور لوعرج اسے اپنی طرف کھینچ رہے ہوں۔ جیسے وہ پھر اجنتا اور ایلورا کے بیجان غاروں میں پہنچ گیا ہو۔ جیسے جمنا کے کنارے چاندنی میں نہائے ہوئے تاج کے جادو نے اسے پھر ڈس لیا ہو۔ اور پھر اسے ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی ان دیکھی طاقت اسے پھر قلم اٹھا لینے پر مجبور کر رہی ہو۔ اس کی طبیعت چاہتی وہ ان احساسات کو کاغذ پر بکھیر دے۔ لیکن پھر سو نہ جاتی اور وہ اس طرح دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا جیسے کوئی اس سے اسے چھیننے جا رہا ہو۔

اس ذہنی انتشار سے چھٹکارا پانے کے لئے۔ کتابوں، شاعروں اور ادیبوں کی دنیا سے نکل بھاگنے کے لئے وہ اس پہاڑی مقام پر موتا کے ساتھ چلا آیا تھا۔ یہی سب کچھ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی ۔ اور جب اس کی آنکھ کھلی تو سامنے مسہری پر گہری نیند میں سوئی ہوئی موتا پر اس کی نظر پڑی۔ اس کے ہونٹ مسکرا اٹھے۔ اور وہ گنگنا اٹھا ۔

ان کے سونے کی اداؤں میں ہے کچھ ایسی دلکش

محوِ حیرت ہوں کہ بیدار کروں یا نہ کروں

گہری نیند میں بے خبر وہ کچھ ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے .....

جیسے کو سوچتے ہوئے وہ ڈھونڈنے لگا کہ کہیں پھر اس کا دماغ اسے کہیں اور نہ لے اڑے۔ سیاہ گیسوؤں کی لٹیں کچھ اس طرح بکھر بکھر کر اس کے چہرے پر آگئی تھیں کہ وہ بے ساختہ اپنی اس حسین پری کو پیار کر لینا چاہتا تھا۔ اور وہ جیسے ہی کرسی چھوڑ کر اٹھا اس کی نگاہیں کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر پڑیں۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ وہیں جم گئی ہوں۔ بادل کا ایک آوارہ ٹکڑا آسمان کے نیلے سمندر میں آہستہ آہستہ تیر رہا تھا۔ پہاڑی نالی کے پاس اُگے ہوئے خود رو درختوں کی چھدری شاخوں سے چھن چھن کر اس کی شعاعیں عجیب سماں پیدا کر رہی تھیں۔ اس کے خیالات گڈمڈ ہو کر رہ گئے

قدرت کے دو حسین شاہکار! یکساں اور بالکل یکساں ۔ اور اس کے قدم بیچ راہ ہی میں رُک کے رہ گئے! دونوں طرف طاقت برابر تھی۔ اور وہ ان دو متضاد طاقتوں کے درمیان کھڑا رہا۔ اور پھر وہ آہستہ آہستہ اٹھنے

لگا۔ اوپر کی طرف اور اوپر کی طرف! اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی گول گول آنکھوں میں "ورڈز ورتھ" سما گیا ہو۔ اور اسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے پہاڑ، چشمہ، جنگل اور ڈوبتے ہوئے سورج کے بے جلے منظر سے ایک سایہ ابھر رہا ہو۔ ایک عجیب پُرکشش سیارہ جو اس کی بکہ۔ اس کے اور اک ادراک کے فہم وتصور سے بالاتر ہے۔ اور پھر اسکے کانوں میں ایک سرگوشی محسوس ہوئی۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔

اس سے پہلے کہ اس سورج کو تاریکی نگل لے، یہ درخت سوکھ جائیں، یہ چشمہ سوکھ جائے۔ اور تمہارے ذہن پر چھایا یہ مبہم لیکن پرکشش سایہ غائب ہو جائے تم انہیں کاغذ پر منتقل کر کے ابدی زندگی دے دو۔"

شاید یہ کیٹس کی آواز تھی۔

اور پھر اس کے قدم چل پڑے۔

وہ پہاڑی پر چڑھ رہا تھا۔ قدرت کے بکھرے ہوئے ان شاہکاروں کی رعنائیوں کو وہ نس نس میں رچا لینا چاہتا تھا۔ اس کے قدم ابھی تھکے نہیں تھے۔ اور وہ ابھی کسی اور اونچی چٹان پر بیٹھ کر فکر وتدبر کے منتشر اور بکھرے ہوئے موتیوں کو یکجا پرونے کی کوشش بھی نہیں کر سکا تھا کہ مونا اس کے پاس آ گئی۔

"اور ما آپ بھی خوب ہیں۔ مجھے تنہا چھوڑ کر چلے آئے؟"

پیار بھرا شکوہ!

لیکن اس کے پیار کی حلاوت اس کے کام و دہن سے بے کی اس تلخی کو نہیں مٹا سکی جس کے ایک حصے سے وہ اب تک مدہوش ہو رہا تھا۔ اور اس نے

منت کرتے ہوئے کہا۔

"پیاری! تم مجھے ابھی تنہا چھوڑ دو"

اور وہ ابھی کچھ اور کہنے والا تھا۔ منت کے جملے، التجا کے الفاظ۔ اک سامنے کچھ فاصلے پر اسے دو انسانی ہیکلے نظر آئے۔ ایک مرد، ایک عورت۔ مرد کے چہرے سے وہی التجا، وہی منت ٹپک رہی تھی۔

"مجھے تنہا چھوڑ دو"۔

اس نے کہا۔ "مونا کتنا اچھا ہو تم اس لڑکی سے جا کر ملو۔ اسے اپنی سہیلی بنالو۔ اس اجنبی جگہ میں تمہاری ایک ملاقاتی تو ہو جائے گی۔

اور جیسے مونا کو اس پر رحم آگیا ہو۔ وہ ڈھلوان پر آہستہ آہستہ اترنے لگی۔ اس نے دیکھا سامنے دوسری لڑکی بھی واپس اتر رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے سامنے بڑا سا آئینہ ہو۔ جس میں خود اس کا عکس نظر آرہا ہو۔ اس کے احساسات، خیالات اور حرکات کا۔ اس نے جھک کر نیچے دیکھا۔ مونا اور وہ دوسری لڑکی بیچ بیچ متعارف ہو گئی تھیں اور دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوٹل کی طرف جا رہی تھیں۔

وہ چپ چاپ ایک ٹیلے پر بیٹھ گیا۔ ایک خالص طمانیت، ایک خاص سکون کا احساس اسے ہونے لگا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ادھر ادھر تیزی سے بھٹکتے ہوئے خیالات ایک مرکز پر آگئے تھے۔ لیکن پھر بھی اسے کچھ کچھ بے کلی محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس نے کوئی چیز کھو دی ہو۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہو۔ اس کے سکون اور طمانیت کی تکمیل کے لئے۔

جیسے ایک خلا رہ گیا ہو۔ اور اس کی روح جیسے اس میں ٹنگ کر رہ گئی ہو۔

اس نے نظریں اٹھائیں۔ دوسرا شخص بھی اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھا کوئی تصویر بنانے میں محو تھا۔ شاید وہ ایک مصور تھا۔

اور جب شام کے سائے گہرے ہو گئے۔ اور رات کی رانی نے اپنی سلمہ ستارے سے ٹکی اوڑھنی ساری فضائے بسیط پر اوڑھادی تو وہ نیچے اتر آیا سامنے ٹیلے پر اس نے نظر دوڑائی۔ لیکن وہ مصور اس سے پہلے جا چکا تھا۔ جب وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو اس نے دیکھا مونا اسی لڑکی کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی ہے۔

مونا نے کہا۔

"اتفاق دیکھئے یہ میری سہیلی ہی نکلی۔ ہمارے بغل والے کمرے میں کل ہی سے رہ رہی ہے۔"

پھر وہ فوراً ہی دروازے تک یہ وہ برابر کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ ایک تو وہ دو سہیلیوں کی آزاد گفتگو میں مخل ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔ دوسرے ابھی اسکے ذہن پر وہ اثر زندہ تھا۔ اور وہ اس کے مدھم مدھم کیف سے لطف اندوز ہوتے رہنا چاہتا تھا۔ لیکن جیسے ہی زینے کی طرف مڑا۔ بغل والے کمرے کے دروازے پر اسے وہی مصور نظر آیا جو اس کے مقابل پہاڑی پر تنہا بیٹھا کوئی اسکیچ تیار کر رہا تھا ایک خاص مسکراہٹ اسکے لبوں پر دوڑ رہی تھی۔

"کیا اچھا ہو اس وقت ہم دونوں بھی یہاں بیٹھ کر باتیں کریں۔"

اور وہ جواب میں کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔

ایک ہی کوچ میں دونوں ڈوب گئے۔ کمرے کی سلیقگی اس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ وہ اس سے پہلے ہی سے ہوٹل میں مقیم ہے۔ کمرے کا جائزہ لیتے

ہوئے اس کی نگاہیں ایک جگہ آکر تھم گئیں۔ مصور کا تازہ اسکیچ دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا گیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر اسے غور سے دیکھتا رہا۔ جیسے وہ کینوس کا بورڈ نہیں، ایک آئینہ ہو۔ جس میں اس کے اپنے خدوخال کی ہی نہیں، اس کے اپنے تصورات اور احساسات کی بھی جھلک دکھائی پڑ رہی ہو۔ تصویر ابھی مکمل نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ ابھی ابتدائی خاکہ ہی تیار ہوا تھا۔ پھر بھی اسکے سامنے وہ منظر بالکل صاف تھا۔

شفق کی سرخیوں سے حسین پہاڑی۔ اور وہاں دو انسانی سائے، دو ساتھی۔ اور پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ تصویر بول رہی ہو۔ منت کے جملے۔ التجا کے الفاظ۔

"پیاری مجھے ابھی تنہا چھوڑ دو۔ مجھے فطرت کے اس سحرآگیں لمحے میں جذب ہو جانے دو......"

اور وہ مڑ کر یکایک مصور سے مخاطب ہو گیا۔

"کیا آپ بھی یہی سوچتے ہیں؟"

"ہوں۔۔۔ اور آپ کیا سوچتے ہیں؟" جواب مختصر تھا۔ لیکن ایک خاص مسکراہٹ اس میں گھلی ہوئی تھی۔

"میں کچھ نہیں سوچتا۔ سوچنے پر مجبور کر دیا جاتا ہوں۔ ایک کشمکش، عجیب الجھن۔ لیکن..... لیکن میں نے تو شاہ کو آپ کے چہرے پر بھی وہی التجا دیکھی تھی وہی آرزو۔ وہی کیفیت۔ جیسے آپ کو بھی اس ناگ نے ڈس لیا ہو۔ جیسے آپ پر بھی وہی جادو چل گیا ہو۔"

اور جواب میں مصور پھر مسکرایا۔

"ہوں! یہ احساس۔ یہ کیفیت ہر حساس دل و دماغ کے لئے یکساں ہے۔ ہر فنکار کے لئے یہ کشمکش لابدی ہے۔"

اور پھر جب وہ واپس اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے قدم دروازے پر ہی رک گئے۔

مونا تنہا کھڑکی کے پاس کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ کھڑکی کے باہر، پھر چاندنی نکھر آئی تھی۔ درختوں کے پتوں پر چاندنی رقص کر رہی تھی۔ تھرکتی پھر رہی تھی۔ پہاڑی چشمہ دور دھیما ہو گیا تھا۔ اس کی موسیقی اور ترنم میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اور دور آسمان کے نیلے سمندر میں بہشت کا مانجھی چاند کی کشتی کو آہستہ آہستہ کھے رہا تھا۔ اور یہاں مونا کھڑی تھی۔ چاندنی میں نہائی ہوئی۔

اور کسی نئے خیال کے تحت یکایک اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اور اس کے لب آہستہ آہستہ جنبش کرنے لگے۔

"اس کے بغیر۔۔۔۔۔ اس کے بغیر۔۔۔۔۔ قدرت کے اس حسین شاہکار کے بغیر۔۔۔۔۔"

اور اس نے دوڑ کر مونا کا ہاتھ چوم لیا۔ اور وہ مسکرا رہا تھا۔ جیسے اس کی کشمکش اور الجھن کا جواب اسے اب مل گیا ہو۔

نقشِ پس ورق

Only cover printed at Royal Art Press Patna-6